ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.5 No.4 2021

مستنصر حسین تارڑ کی غیر افسانوی نثر بہ حوالہ خاکہ نگاری

MUSTANSAR HUSSAIN TARAR'S NON FICTAION PROSE WITH SPECIAL REFERANCE TO HIS SKETCHES WRITING

*عاصم علی
پی ایچ ڈی سکالر (اردو)، ادارہ زبان و ادبیات اردو، جامعہ پنجاب، لاہور

Mustansar Husain Tarar, a Pakistani writer is well-known name in the contemporary Urdu literature. Mr. Tarar has marvelous contribution in writing travelogue. Besides, travelogue writing he has a great contribution in writing columns, novels, dramas, fictions and sketch writing. This creative journalist has exhibited pronounce interest in the history. He has appropriately used historical information in his travelogues and other writings. One may find the work of this globally recognized writer in the curricula of Russian university. The article covers the non-fiction work sketches writing of this great writer.

Keywords:*Mustansar Husain Tarar, ShafiqurRehman, Col. Muhammad Khan, Muhammad Khalid Akhtar, Abdullah Hussain, Non Fictaion Prose, Sketches Writing*

کلیدی الفاظ: مستنصر حسین تارڑ، شفیق الرحمن، کرنل محمد خان، محمد خالد اختر، عبداللہ حسین، غیر افسانوی نثر، خاکہ نگاری

ادب کو زندگی کا آئینہ قرار دیا جاتا ہے کہ کیوں کہ اس میں زندگی کے ہر پہلو کا عکس دکھائی دیتا ہے۔ ادب انسانی تخلیق کا وہ فن ہے جس میں زندگی سے جڑا ہر مسئلہ موجود ہے۔ انسان کی شخصیت کا بھرپور عکس سوانح نگاری یا خاکہ نگاری کی صورت میں ملتا ہے جو ادب کی مختصر غیر افسانوی صنف نثر ہے۔ اردو کی اس غیر افسانوی نثر نے بہت کم عرصے میں اپنی جڑیں مضبوط کر لی ہیں۔ خاکہ نگار کسی شخصیت کے ظاہری اور باطنی اوصاف کی قلمی تصور کشی کرتا ہے جس کی بدولت قاری کے سامنے اس شخصیت کی خوبیاں اور خامیاں واضح ہو جاتی ہیں۔ یہ شخص کی زندگی کا عکاس نہیں ہوتا بل کہ اس کی نمایاں خصوصیات واضح کرتا ہے۔ اردو ادب میں خاکہ نگاری کے ابتدائی نقوش تذکرہ نگاروں کے ہاں ملتے ہیں 'آب حیات" میں اس کے ابتدائی نمونے موجود ہیں۔ مرزا فرحت اللہ بیگ نے بیسویں صدی کے دوسری دہائی میں "نذیر احمد کی کہانی، کچھ ان کی کچھ میری زبانی" لکھ کر اس صنف کا باقاعدہ آغاز کیا۔ مرزا فرحت اللہ بیگ نے خاکہ نگاری کے ایک نئے دور کا آغاز کیا اس کے ارتقا میں حصہ لینے والے ادیبوں میں مولوی عبدالحق، محمد شفیع دہلوی، عبدالماجد دریابادی، رشید احمد صدیقی جیسے نام شامل تھے۔ بیسویں صدی میں اردو ادب نے کئی نئے رجحانات اور تحریکات کے اثرات قبول کیے۔ اردو میں خاکہ نگاری کو پروان چڑھانے میں ایسے ادیبوں نے اہم کردار ادا کیا جنھوں نے افسانہ نگاری، ناول نگاری، انشائیہ نگاری اور مزاح نگاری میں نام کمایا۔ اس بنا پر ان تمام افسانوی اصناف ادب کی خصوصیات خاکہ نگاری میں یکجا ہو گئی ہیں۔ خاکہ نگاری کی صنف نے ان نئے رجحانات کے اثرات کے ذریعے اثر حقیقت نگاری کو اپنایا اور اس سلسلے کا باقاعدہ آغاز ۱۹۴۷ کے بعد ہوا۔ اس دور کے اہم خاکہ نگاروں میں عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو، شوکت تھانوی، مالک رام، اعجاز حسین، چراغ حسن حسرت، تمکین کاظمی، رئیس احمد جعفری، محمد طفیل، عبدالمجید سالک، شاہد احمد دہلوی، علی جواد زیدی، الطاف حسین قریشی، خواجہ حسن نظامی، جوش ملیح آبادی، مرزا محمد بیگ، فکر تونسوی، قرۃ العین حیدر، انتظار حسین، اے حمید، مجید لاہوری اور مشفق خواجہ جیسے ادیبوں کے نام شامل ہیں۔ عصر حاضر میں خاکہ نگاری کی صنف نثر میں طبع آزمائی کرنے والوں میں مستنصر حسین تارڑ کا نام سر فہرست ہے۔ انھوں نے باقاعدہ طور پر اس صنف نثر کو نہیں اپنایا۔ انھوں نے اپنے عزیز دوستوں شفیق الرحمن، کرنل محمد خاں، محمد خالد اختر اور عبداللہ حسین سے طویل رفاقت کی بنا پر ان کے خاکے لکھے۔ شفیق الرحمن، کرنل محمد خان اور محمد خالد اختر کے خاکہ ان کے مرتبہ خطوط کے مجموعے "خطوط: شفیق الرحمن، کرنل محمد خان اور محمد خالد اختر" میں شامل ہیں۔ عبداللہ حسین کا خاکہ " عبداللہ حسین" کے عنوان سے لکھا اور یہ خاکہ "سویرا" کے شمارہ نمبر ۱۹۵ اپریل ۲۰۱۴ء میں شائع ہوا۔

متمدن انسان کے خطوط ہی اس کی زندگی کے پوشیدہ گوشوں کو بے نقاب کرتے ہیں در اصل مکاتیب تاریخ اور سوانح کے بنیادی مآخذ ہیں۔ نجی خطوط میں بے تکلف مضامین لکھے جاتے ہیں۔ وہ مکتوب نگار کی شخصیت کا بے لاگ اور بے تکلف اظہار کرتے ہیں(۱)۔ مستنصر حسین تارڑ کی اپنے ہم عصر ادیب دوستوں میں بہ طورِ خاص شفیق الرحمن، کرنل محمد خان اور محمد خالد اختر کے ساتھ طویل عرصہ خط و کتابت کا سلسلہ رہا۔ مستنصر حسین تارڑ کے نام ان ناموں کو انھوں نے مجموعہ کی صورت "خطوط: شفیق الرحمن، کرنل محمد خان، محمد خالد اختر" کے عنوان سے مرتب کر کے ۲۰۱۲ء میں شائع کیے۔ مجموعہ میں فہرست مشمولات میں انھوں نے "تین بد نصیب دیوتا" کے تحت کتاب کی پیش لفظ میں ان خطوط کو مرتب کرنے کی وجہ بیان کی ہے اور "لوگ جنھوں نے مسکرانا سکھایا" کے عنوان سے مکتوب نگاروں کے خاکے پہلو بہ پہلو مکتوبات میں یکجا کیے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.5 No.4 2021

نے ان نابغہ روزگار شخصیات کی زندگیوں کے مختلف پہلوؤں کی بازیافت کرتے ہوئے انھیں قارئین کے لیے پیش کیا ہے۔جو ان کی شخصیات، حالات زندگی اور زندگی سے متعلق مختلف واقعات سے ان کی شخصیت کی تفہیم کو قارئین کے لیے آسان بنا دیتی ہے۔

انسان ہمیشہ ہی اپنے محبت کرنے والوں سے خاص تعلق کی بنا پر دوسروں پر فخر محسوس کرتا ہے۔وہ اس بات کو دوسروں تک باور کرانے کے لیے یادگار زمانہ سے مثالیں تلاش کرتا ہے کہ دیکھو مجھے ان شخصیات سے تعلق پر اسی طرح فخر ہے جیسے مجھ سے پہلے لوگ ان ہستیوں کے تعلق کی بنا پر فخر محسوس کرتے تھے۔مستنصر حسین تارڑ نے بھی شفیق الرحمن، کرنل محمد خان اور محمد خالد اختر سے محبت کے اس تعلق پر ''تین بدنصیب دیوتا'' کے عنوان کے تحت ان الفاظ میں فخر کا اظہار کیا ہے:

> ''دانش ور اور انگریزی صحافت کے ستونوں میں سے ایک مولوی محمد سعید ''پاکستان ٹائمز'' کے ایڈیٹر بھی رہے۔مولوی صاحب نے شہر لاہور کی قدامت اور تخلیقی مزاج کے حوالے سے ایک یادگار کتاب تحریر کی اور مجھے فخر ہے کہ انہوں نے خصوصی طور پر اس کی ایک جلد اپنے دستخطوں کے ساتھ مجھے بھی عطا کی تو اس کا انتساب شاید یوں تھا کہ۔۔مجھے فخر ہے کہ میں تب لاہور میں تھا جب مشرق کا سب سے بڑا شاعر اقبال، مشرق کا سحر بیاں مقرر عطااللہ شاہ بخاری اور دنیا کا سب سے بڑا پہلوان گاما بھی لاہور میں مقیم تھے۔۔اگر میں بھی گزر چکے زمانوں کی کوئی داستان قلم بند کروں تو اس کا انتساب یقیناً کچھ یوں ہو گا۔۔کہ مجھے فخر ہے کہ میں ان زمانوں میں سانس لیتا تھا جب اردو ادب میں شگفتہ نگاری اور رومان کے سب سے بڑے تخلیق کار شفیق الرحمن، کرنل محمد خان اور محمد خالد اختر میرے ہم عصر تھے اور ان تینوں کی تحریروں کی اثر انگیزی نے مجھ بیمار میں بھی ایک نئی روح پھونک دی۔''(۲)

ہر انسان کی زندگی خوشیوں کے پہلو بہ پہلو دکھ و کرب سے بھی بھری ہوتی ہے۔بالکل اسی طرح شفیق الرحمن، کرنل محمد خان اور محمد خالد اختر کی زندگی بھی خوشیوں کے پہلو بہ پہلو دکھ و کرب سے خالی نہ تھی۔ادب میں ان کو جتنی پذیرائی حاصل ہوئی اس کے برعکس ان کی حقیقی زندگی دکھ اور مصائب سے بھرپور تھی۔مستنصر حسین تارڑ ان کے دکھ و کرب کا پہلو اپنی کتاب ''خطوط': شفیق الرحمن، کرنل محمد خان، محمد خالد' میں ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

> ''شفیق الرحمن، کرنل محمد خان اور محمد خالد اختر اردو ادب کے معبد میں تین ایسے دیوتا تھے جن کے چرنوں میں مزاح، شگفتگی اور رومان کی دیوداسیاں ہاتھ جوڑے پرنام کرتی گیندے کے پھول چڑھاتی تھیں۔۔لیکن یہ تینوں بدنصیب دیوتا تھے۔ان کے نصیب کی تختی پر شہرت اور ناموری کے پہلو بہ پہلو سوگواری، ناآسودگی، خودکشی اور دھتکار رقم کر دی گئی تھی۔۔کسی بھی یونانی المیہ نگار چاہے وہ اسکلس ہو یا یورپڈیز۔۔کے ڈرامے میں ایسے تین بدنصیب کردار تو نہ ہوں گے جنہوں نے خلق خدا کو مسکراہٹوں، مسرّتوں، رومانوی خوابوں اور زندگی کی سرخوشیوں سے آگاہ کیا ہوا اور وہ خود نصیب کے سیاہ سمندروں میں سے ابھرنے والے فنا کے عفریتوں کا شکار ہو گئے۔۔مر گئے۔۔شفیق صاحب آرمی قبرستان میں، خالد صاحب کراچی کے کسی نامعلوم قبرستان میں اور کرنل صاحب اپنے گاؤں کی دھول میں اٹی ایک قبر میں کب سے پنہاں ہو چکے۔۔۔ان کے ڈھانچوں میں اب تو کیڑے مکوڑے بھی کہاں رینگتے ہوں گے۔۔وہ تو کب کا ان کا ماس کھا چکے پر مجھے یقین ہے کہ ان تینوں کے ڈھانچوں میں اب بھی ایک دل ڈھرکتا ہو گا۔۔۔آج بھی اگر آپ ان تینوں کی تحریریں پڑھیں تو آپ کو ان میں ایک ڈھرکن محسوس ہو گی کہ فنا بھی اس دھڑکن سے محصور ہو کر تھم گئی ہو گی۔۔۔ہم جیسوں کا دل جب ایک بار تھم جائے گا تو فنا ہر گز ہمارے لیے نہیں تھمے گی تو اس سے پیش تر۔۔۔ان تینوں کے چند خطوط جن کے دل کبھی نہ تھمیں گے۔۔''(۳)

شفیق الرحمن کا نام اردو ادب میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔وہ اردو ادب میں رومانوی افسانہ نگاری اور طنز و مزاح کی وجہ سے شہرت رکھتے تھے۔انھوں نے افسانے، خاکے، سفرنامے لکھے، شاعری کی اور تراجم کیے مگر اپنا جداگانہ سحر انگیز اسلوب پر قرار رکھنے میں کامیاب و کامران ٹھہرے۔مزاح نگار کثیر جہتی آزمائشوں سے آنکھیں چار کرتے ہوئے اپنا تخلیقی وقار مکمل طور پر برقرار رکھتے ہیں۔حد تو یہ ہے کہ پیروڈی کرتے ہوئے بھی کوئی ہلکا سا دل آزار جملہ ان سے سرزد نہیں ہوتا۔ڈاکٹر اشفاق احمد ورک۔''شفیق الرحمن: شخصیت اور فن'' میں لکھتے ہیں:

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.5 No.4 2021

"شفیق الرحمن اردو ادب کا وہ درخشندہ ستارہ ہے جو ساٹھ برس تک آسمان ادب پر پوری آب و تاب کے ساتھ روشن رہا۔ انھوں نے لکھنے کا آغاز اس وقت کیا جب ترقی پسند تحریک کا غلغلہ ابھی تازہ تازہ بلند ہوا تھا۔ اور ہمارے بے یمار نئے اور پرانے لکھنے والے اس سے بالواسطہ یا بلاواسطہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے تھے، ان حالات میں بھی شفیق الرحمن نے زمانے یا فیشن کی رو میں بہنے کی بجائے اپنی مرضی اور مزاج کے تابع رہ کر لکھا۔ افسانہ اور مزاح شفیق الرحمن کی دو بنیادی محبتیں قرار پاتی ہیں۔ ان محبتوں کو انھوں نے آخر دم تک نبھایا۔ انھوں نے اپنی زندگی میں کوئی خاکہ لکھا یا تبصرہ، سفر نامہ تحریر کیا یا افسانہ، وہ اردو ادب میں کسی پیروڈی کے مرتک ہوئے یا کوئی نظم ان کے شریر قلم سے سرزد ہوئی، افسانوی اسلوب یا مزاح کی شوخی کو کسی مقام پر بھی انھوں نے ہاتھ سے جانے نہیں دیا بلکہ ان کی اکثر تحریروں میں تو افسانہ، مزاح اور شفیق الرحمن میں تو من شدم، تو من شدی والی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ طویل عرصے تک ادب سے منسلک رہنے کے باوجود انھوں نے نہ تو کوئی ادبی فلسفہ پیش کیا، نہ کسی تحریک یا رجحان سے متاثر و متعلق رہے۔ حتیٰ کہ ادبی دریا میں رہتے ہوئے کسی ادبی مگرمچھ سے بیر یا دوستی کا خیال بھی ان کے دل میں نہیں آیا۔ اس کے باوجود ان کی شہرت کا گراف ہمیشہ انتہائی بلندیوں پہ نظر آیا۔۔۔ انھوں نے اپنی تحریروں سے کوئی معرکہ سر کرنے یا قلعہ فتح کرنے کی بجائے افسردہ دلوں کی کلیاں کھلانے کا کام لیا۔ جس میں وہ نہ صرف آخر دم تک کامیاب دکھائی دیے بلکہ اس بنا پر تفریحی ادب کے سب سے بڑے نمائندہ قرار پائے۔"(۴)

مستنصر حسین تارڑ سے شفیق الرحمن کا پہلا تعارف بہ طور مصنف "برساتی" ہوا۔ انھوں نے لڑکپن میں جن مشہور ادیبوں کی تصنیفات کا مطالعہ کیا ان میں سر فہرست شفیق الرحمن کا نام بھی تھا۔ شفیق الرحمن کی تحریروں نے ان کے اندر کے سیاح کو زندہ کیا۔ مستنصر حسین تارڑ اپنے پنجابی ناول "پکھیرو" کی افتتاحی تقریب کے سلسلے میں پنڈی تھے جہاں شفیق الرحمن سے ان کی پہلی ملاقات راول پنڈی کلب میں ہوئی اور پھر ملاقاتوں کا یہ سلسلہ شفیق الرحمن کی زندگی تک جاری رہا۔ شفیق الرحمن نے انھیں اس موقع پر اتوار کا دن اپنے ساتھ گزارنے کا حکم دیا۔ اس دن کی یادداشت کو "لوگ جنھوں نے مسکرانا سکھایا" کے عنوان سے قلم بند کیا ہے۔ شفیق الرحمن سے پہلی ملاقات کا احوال بیان کرتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں:

"ہماری خط کتابت تو ایک عرصے سے آن اینڈ آف جاری تھی لیکن خواہش کے باوجود اور اس میں میری ازلی سستی کا عمل دخل بھی شامل تھا میں ان سے چہرہ بہ چہرہ، روبہ رو نہ ہو سکا۔۔ شاید یہ ۱۹۷۵ء لگ بھگ کے زمانے تھے جب میرا پہلا اور آخری پنجابی ناول "پکھیرو" چھپنے پر فضل الٰہی بہار نے اپنی پنجابی تنظیم کی جانب سے راول پنڈی میں اس کی افتتاحی تقریب کا اہتمام کیا جس کی صدارت خالد سعید بٹ نے کی اور مہمان خصوصی محترم ضمیر جعفری تھے۔۔ تقریب میں روال پنڈی اسلام آباد کے تقریباً سبھی ادیب اور شاعر شریک ہوئے اور ان میں منصور قیصر اور پروین ملک بھی شامل تھے۔ مجھے گمان ہے کہ منشایاد بھی موجود تھے۔۔ ضمیر صاحب نے ادب میں میری آمد اور غیر متوقع پذیرائی کے حوالے سے "اردو ادب میں سفیدے کا درخت" کے عنوان سے ایک ایسا شاندار اور میرے دل کو خوش کر دینے والا مضمون پڑھا جس کی بازگشت آج بھی سنائی دیتی ہے۔ میں نے راول پنڈی پہنچتے ہی شفیق صاحب سے رابطہ کیا اور انہوں نے اگلے روز مجھے پنڈی کلب میں دوپہر کے کھانے کے لیے مدعو کر لیا۔ اس پہلی ملاقات پر میں ایک ایسے ٹین ایجر لڑکے کی طرح نروس تھا جو اپنی زندگی کی پہلی محبت سے ملنے کے لیے اپنا بہترین لباس پہن کر جا رہا ہو اور اس کا دل ایک کبوتر کی مانند اس کی پسلیوں میں پھڑپھڑایا ہو۔۔ شفیق صاحب ایک سیاہ تھری پیس سوٹ میں ملبوس جس کی ہر تہہ میں بار بار استری کی زد میں آئی ہو گی۔۔ ترشے ہوئے نین نقش، فوجی انداز کے کٹے ہوئے سلیقے سے ترتیب شدہ سفید بال اپنی دراز قامتی کے ساتھ مسکراتے ہوئے میری جانب چلے آتے تھے۔۔ اور ان کے برابر میں ایک انھی کے قد کاٹھ کا ایک وجیہہ شخص، جس کا چہرہ رف اور ٹف تھا، البتہ اس کے بال دفیق صاحب کی نسبت ذرا دراز تھے اور وہ گھنی ترشی ہوئی مونچھوں سے بھی مزین تھا، چلا آتا تھا۔۔ یہ کرنل محمد خان سے بھی میری پہلی ملاقات تھی۔۔ اور ان دنوں "بجنگ آمد" کا طبل جنگ کل پاکستان میں گونج رہا تھا۔"(۵)

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.5 No.4 2021

شفیق الرحمن سے اس ملاقات کے دوران وہاں کرنل صدیق سالک اور ضمیر جعفری بھی تھے۔ روالپنڈی میں اس قیام کے دوران مستنصر حسین تارڑ پہلی بار احمد فراز سے بھی متعارف ہوئے جو کہ پر خلوص اور چاہنے والے دوست ثابت ہوئے۔ مستنصر نے شفیق الرحمن کا خاکہ اس طرح کھینچا ہے کہ پڑھنے والے کے سامنے ان کی تصوراتی تصویر بن جاتی ہے۔ اس میں عقیدت و محبت کے آثار واضح نظر آتے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ "خطوط: شفیق الرحمن، کرنل محمد خان، محمد خالد اختر" میں لکھتے ہیں:

> "وہ شہر سخن کا شہزادہ تھا۔۔ اس کی رگوں میں رومان اور تحریر کی دل نشینی کی حدت بھری دھوپ ہمہ وقت یہاں تک کہ زندگی کے آخری ایام بھی اس کے زوال پذیر بدن کو روشن کرتی تھی۔۔ وہ زندگی کی پر شور "بے بی" ندی میں چھلانگ لگا کر اس کی تہہ میں پوشیدہ پتھروں پر نقش کہانیاں اپنی آنکھوں میں سموتا اور پھر سطح آب پر نمودار ہو کر انہیں اپنے کسی قدر نسوانی طرز تحریر میں رقم کرتا اور برصغیر میں جہاں کہیں بھی دل تھے، وہ ان کی تحریر کے سحر سے دم بھر کے لیے دم نہ لیتے، رکنے کو آتے۔۔ وہ ادب کی رائلٹی تھا، ایک نیلے خون والا شہزادہ تھا، ایک ایسا لارڈ بائرن تھا جس کی آوارگی، صحرا نوردی اور جنوں خیزی نے لوگوں کو مسخر کر لیا۔ اگرچہ وہ بائرن کی مانند لنگڑاتا نہ تھا۔۔ مردانہ وجاہت کا ایک ایسا شاہکار تھا کہ اگر مائیکل انجلو کے زمانوں میں ہوتا تو وہ اپنے مجسّمے "ڈیوڈ" کے ماڈل کے طور پر اس کا انتخاب کرتا۔۔۔ اور اسے اپنی خوش شکلی پر کچھ گھمنڈ بھی تھا جو اس کی تحریروں میں جا بجا جھلکتا تھا۔۔۔ اور گھمنڈ کیوں نہ ہوتا، اگر اللہ تعالیٰ نے اسے شکل عطا کی تھی تو وہ اس کی ناشکری کا مرتکب ہوتا۔۔۔ وہ ادب میں ایک پرنس آف پلیئرز تھا۔۔ ایک ایسا آوارہ گرد تھا کہ ستر برس کی عمر میں بھی اس کے جوگرز کے تسمے کھلے رہتے تھے کہ وہ زمانے کے ساتھ چلتا تھا۔۔ نہ صرف اس کے جوگرز کے تسمے بل کہ اس کی نصف آستینوں کی سپورٹس شرٹس کے بالائی بٹن بھی کھلے رہتے اس کی فراخ چھاتی پر جو بال سفید ہوتے تھے، وہ ڈھلتے سورج کی کرنوں میں جب کہ وہ اپنے گھر کے گیراج میں ورزش کر رہا ہوتا تھا، سنہری ہونے لگتے تھے گمان تک نہ ہوتا تھا کہ اس کے ہونٹ اگر بھنچے رہتے ہیں تو ان میں پوشیدہ اس کے مستعار شدہ سفید دانت ہیں۔۔۔"(6)

شفیق الرحمن نے اپنی زندگی کے پچاس برس پیش تر زمانوں کو اپنے گھر کی بالائی منزل کے کمرے میں جو ہر وقت کاٹھ کباڑ سے بھرا رہتا تھا میں ایک صندق میں پوشیدہ رکھا۔ اس کے ڈھکن کھولتے ہی اس میں سے شفیق الرحمن کے بے مثل کردار بر آمد ہونے لگتے۔ شیطان۔۔۔ حکومت آپا۔۔۔ رضیہ۔۔۔ مقصود گھوڑا۔۔۔ بڑی گیدی۔۔۔ بے بی۔۔۔ دلبر۔۔۔ کاؤنٹ کمولا۔۔۔ اور "برساتی" کی این۔۔۔ پرانی تصویری البموں میں بجھے بجھے سے اکثر آؤٹ آف فوکس چہرے۔۔۔ بلیک اینڈ وائٹ تصویریں جن پر سے زمانوں کے اتنے پانی بہہ چکے تھے کہ وہ دھندلا چکی تھیں لیکن شفیق صاحب کی آنکھیں اس صندوق کو کھولتے ہی پچاس برس پیش تر کے ان زمانوں کا سفر کر جاتیں جب ان کی ذاتی زندگی سے مستعار شدہ یہ کردار انھی کی مانند نوخیز اور جوانی کی حدت سے سلگتے تھے اور وہ ان کے بارے میں ایسے باتیں کرتے لگتے جیسے وہ آج بھی زندہ ہوں، وہ ان کے روبہ رو ہوں۔(7) گھر کا یہ نیم اندھیارا کمرا یادوں کا وہ قبرستان تھا جس کی مٹی انھوں نے کبھی خشک نہیں ہونے دی تھی۔ وہ ہر ورز اس صندوق کا ڈھکن اٹھاتے اور اس کی مٹی پر اپنی آنکھوں سے جادواں گلاب رکھتے تھے۔ ان یادوں کو شفیق الرحمن نے مختلف اوقات میں مستنصر سے بانٹا جو ان کی ذات کے نہاں خانوں میں پوشیدہ تھیں۔ قرۃ العین حیدر اور شفیق الرحمن کے درمیان جو ایک تعلق تھا اس کو انھوں نے میمونہ تارڑ اور سلجوق تارڑ کی موجودگی میں سرسری طور پر بیان کیا جو مستنصر نے بیان کرتے ہوئے "خطوط: شفیق الرحمن، کرنل محمد خان، محمد خالد اختر" میں کچھ اس انداز سے بیان کی ہیں:

> "اگر قرۃ العین حیدر فکشن کی ملکہ تھیں اور میں ان کا مداح تھا اور شفیق الرحمن ملک سخن کا شہزداہ تھا تو ان دونوں کے ذاتی تعلقات کے بارے میں تجسس رکھنا میری مجبوری تھی۔ ظاہر ہے میں عینی آپا سے ہرگز شفیق صاحب کے بارے میں کچھ استفسار نہ کر سکتا تھا کہ مجھ میں ان کا غیض و غضب سہارنے کی سکت نہ تھی۔۔۔ لندن میں شفیق الرحمن اور قرۃ العین حیدر کی متعدد ملاقاتیں ہوئیں۔ بقول شفیق صاحب وہ لندن کے کسی طے شدہ بس سٹاپ پر ملاقات کا وقت طے کرتے۔۔ کبھی وہ اپنی ٹائی کی گرہ درست کرتے ہوئے ان کی راہ تکتے اور کبھی وہ ان سے پہلے وہاں پہنچ کر بے تابی سے منتظر اپنی ساڑھی کا پلّو درست کرتیں، کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالتیں اور بار بار ایک چھوٹے سے آئینے کو روبہ رو کر گہرے شیڈ کی لپ سٹک کو اپنے ہونٹوں پر پھیرتی۔۔ منتظر رہتیں۔ پھر ہم ڈنر کے لیے کسی ریستوران میں چلے جاتے۔۔ "اور آپ وہاں کھانے کے لیے کیا آرڈر کرتے۔۔" "میں تو اکثر سبز پتوں والی سلاد وغیرہ پسند کرتا اور عینی۔۔ وہ جو کچھ

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.5 No.4 2021

بھی آرڈر کرتی تیز مرچ مصالحوں والا کوئی سالن ہوتا۔ اسے کھاتے ہوئے سوں سوں کرتی رہتی اور پھر ویٹر سے کہتی۔۔ کچھ مرچی اور لاؤ ۔ وہ مرچوں کو ہمیشہ مرچی کہتی۔۔ اور نہایت رغبت سے یہ مرچی کچر کچر کھاتی چلی جاتی۔۔۔ ایک بار ڈنر کے بعد وہ مجھے لنڈن میں ایک عرصہ سے مقیم ایک ایسی سابقہ طوائف کے پاس لے گئی جس کے کردار کو اس نے "آگ کا دریا" میں پینٹ کیا تھا اور وہ اگرچہ ایک بوڑھی لیکن نہایت طرح دار عورت تھی اور اس نے ہم دونوں کو عجیب سازشی نظروں سے دیکھا۔۔ عینی مرچیں بہت کھاتی تھی۔"(8)

جیسے حسن و جوانی اور ماں باپ سدا نہیں رہتے اور نہ ہی سدا گوریوں کی بانہوں میں کنگن کھنکتے ہی، ایسے ہی ۲۶۔ ویسٹ برج I کے اس گھرے میں سدا بہار نہ رہی، ایک مہیب سیاہ خزاں نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ شفیق الرحمن کی تمام تر ادبی فتوحات کے باوصف جب ہم ان کی ذاتی زندگی پہ نظر کرتے ہیں تو وہ بھی ہمیں قدم قدم پر کامرانیوں سے بھری دکھائی دیتی ہے سرجن ریئر ایڈمرل کے عہدے تک ترقی، دنیا بھر کی سیاحت، اکادمی ادبیات کی پہلی چیئرمین شپ، ستارہ امتیاز، راولپنڈی کے بہترین علاقے میں اپنی ضروریات اور مرضی کے مطابق تیار کیا ہوا اچھا گھر، ایک اچھی اور معروف فیملی میں شادی، پڑی لکھی بیگم، بچوں کی اچھی تعلیم، بہترین ملازمتیں اور مثالی حالات۔ ایسے میں ان کے دو جوان بیٹوں کے ساتھ پیش آنے والے خوف ناک سانحات اور تیسرے بیٹے کی ناکام ازدواجی زندگی مکمل طور ناقابل فہم ہے سمجھ میں آتی کہ ایسے قابل رشک حالات کے باوجود بچوں کی تربیت میں ایسی کون سی کمی رہ گئی کس کی نظر کھا گئی، جس نے خوشیوں کے اس گہوارے کو اداسیوں کے مسکن میں تبدیل کر دیا(۹)۔ دو جوان بیٹوں نے خودکشی کر لی۔ شفیق الرحمن ان کے غم نڈھال اس دنیا سے رخصت ہوئے اور کی بیگم بھی جلد اس دار فانی سے کوچ کر گئیں۔ شفیق الرحمن کے بڑے بیٹے وفات کا واقعہ بیان کرتے ہوئے مستنصر حسین تارڑ "خطوط: شفیق الرحمن، کرنل محمد خان، محمد خالد اختر" میں لکھتے ہیں:

"شفیق صاحب کے بڑے بیٹے نے بائیس برس کے میڈیکل کالج کے سال اول کے طالب علم بھوری مونچھوں والے جونے ریل کی پٹڑی پر سر رکھ کر خودکشی کر لی۔ خودکشی کے مہذب طریقے بھی ہوتے ہیں۔۔ آپ سلیپنگ پلز کی کثیر تعداد پھانک لیتے ہیں، چوہامار گولیوں کو نگل لیتے ہیں، کسی بلند مینار یا پل سے گہرائی میں چھلانگ لگا دیتے ہیں، چھت کے پنکھے سے جھول جاتے ہیں۔۔ لیکن سب سے غیر مہذب طریقہ یہ ہوتا ہے کہ آپ ریل کی پٹڑی پر اپنا سر رکھ دیتے ہیں۔ یا صرف انجن بلکہ پوری ریل گاڑی آپ کے بدن کا قیمہ بناتی گزر جاتی ہے اور شناخت کا امکان نہیں رہتا کہ چند لوتھڑوں سے آپ کوئی بھی شکل مصور نہیں کر سکتے۔ شفیق صاحب کے سب سے بڑے دراز قامت وجیہہ اور پر تمکنت بیٹے کی خون آلود جیب میں ایک ملاقات کارڈ تھا۔۔ وہ کارڈ شفیق صاحب کے ایک قریبی دوست کا تھا۔ وہ آیا، اسے جانے کیسے شناخت کیا اور پھر یہ اندوہناک ذمہ داری تھی کہ ایک دوست اپنے سب سے بڑے بیٹے کی اچانک گمشدگی پہ اگرچہ تشویش میں لیکن اسے کچھ خبر نہیں کہ اس کا ایک قریبی دوست اسے کیا خبر کرنے والا ہے۔۔ اور اس کی لاش ایک تھانے میں فرش پر لاوارث پڑی ہے۔۔"(10)

جوان بیٹے کی موت نے ان کی کمر توڑ دی تھی۔ وہ دوسروں کے سامنے اپنے غم کا اظہار نہ کرتے بس مسکراتے رہتے۔ یہ وہ شفیق الرحمن نہ تھے۔ یہ جھکے جھکے بے ربط چال سے گھر میں بھٹکتے اور چوری چوری روتے پھرتے تھے۔ آہستہ آہستہ ان کے گھر کی خوشیاں رخصت ہونے لگیں۔ شفیق الرحمن کا انتقال ہو گیا۔ بیگم شفیق بھی تنہائی اور بیماری کو برداشت نہ کر سکیں وہ بھی شفیق الرحمن کے پاس چلی گئیں۔ ان کے دوسرے بیٹے نے بھی خودکشی کر لی۔ خوشیوں بھرا گھر غم کی تاریکی میں ڈوب گیا۔ مستنصر حسین تارڑ "خطوط: شفیق الرحمن، کرنل محمد خان، محمد خالد اختر" میں لکھتے ہیں:

"میں ایک بار مری روڈ پر ڈرائیو کرتا ہوا جیسے شفیق صاحب مجھے اپنے گھر کا راستہ بتاتے تھے، بے اختیاری کے عالم میں ادھر کو مڑ گیا۔ اگرچہ وہاں نہ شفیق صاحب تھے نہ ان کی بیگم اور نہ ان کے بیٹے۔۔ کہ وہ چاروں تو منتقل ہو چکے تھے، ویسٹ رج کا آہنی گیٹ زنگ آلود ہو رہا تھا۔۔ بند تھا۔۔ اس کے سب مکین منتقل ہو چکے تھے، وہ گھر اجڑ چکا تھا۔۔ شاید اس کی منزل کے ایک نیم تاریک کمرے میں وہ صندوق اب تک موجود ہو جس میں سے شفیق الرحمن کے لازوال کردار بلیک اینڈ وہائٹ اور اکثر آؤٹ آف فوکس صورتوں میں

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.5 No.4 2021

زندہ ہوتے تھے۔لان کی گھاس سرکنڈوں کی مانند بڑھتی گئی تھی اور اس کمرے میں جھانکتی تھی جس کی ایک دیوار پر ان تینوں کی ایک بلیک اینڈ وائٹ تصویر آویزاں تھی اور شفیق صاحب نے اس تصویر کی جانب نہ دیکھا اور تھا۔۔"ڈیٹ واز دے بوائے۔۔"(۱۱)

شفیق الرحمن اور مستنصر حسین تارڑ دونوں ادیبوں کے درمیان محبت، عقیدت اور احترام کا رشتہ تھا۔وہ ہر موقع پر ایک دوسرے سے مشورہ کیے بغیر ادبی وذاتی کام نہیں کرتے تھے۔کتاب کی اشاعت ہو،سیاحت ہو،بچوں کے تعلیمی میدان کا چناؤ ہو یا ذاتی زندگی کے حوالے سے کوئی اہم فیصلہ وہ ایک دوسرے سے مشاورت سے طے کیا کرتے تھے۔شفیق الرحمن نے اپنی فوجی ملازمت کی وجہ سے دنیا بھر کی سیر کی۔مستنصر جب بھی کسی علاقے کی سیاحت کا ارادہ باندھتے تو ان کو خطوں لکھ بھیجتے اور وہ انھیں اس علاقے کے موسم،حالات وثقافت سے آگاہ کر دیتے جس سے سفر میں ان کے لیے آسانی رہتی۔انھوں نے مستنصر کے ادبی سفر مین رہ نما کے طور پر مفید مشوروں سے نوازا جس پر وہ آج بھی ان کے ممنون ہیں۔مستنصر کے معاصر ادیبوں سے چشمک کی بنا پر دونوں میں غلط فہمیاں پیدا کرنے کی کوشش کی لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔ان کی دوستی جس کا آغاز بہ طور فین ہوا تھا شفیق الرحمن کی زندگی تک جاری رہا۔ان کے یہ خطوط ادب کا اہم سرمایہ ہیں جس سے ان کے زندگی کے اہم گوشے منور ہوتے ہیں۔مستنصر حسین تارڑ سے طویل خط وکتابت کا ہی نتیجہ ہے کہ انھوں نے شفیق الرحمن کی ذاتی اور ادبی زندگی کے اہم رازوں سے پردا اٹھایا ہے۔انھوں نے بہ طور خاکہ نگار شفیق الرحمن کی زندگی کی دلکش اور دلچسپ تصویر کشی کی ہے۔

کرنل محمد خان کا نام اردو مزاح کا معتبر حوالہ ہے جس نے ادب میں اپنی الگ راہ نکالی۔اردو مزاح نگاری کی تاریخ میں کرنل محمد خان کا فن سنجیدہ توجہ کا حامل ہے کیوں کہ ان کا فن محض وقت گزاری کا وسیلہ نہیں بل کہ ایک سنجیدہ عمل ہے۔ہر بڑا فن کار اپنے ادب کی از سر نو تشکیل کرتا ہے۔۔۔بڑا ادب خود کسوٹی بن جاتا ہے اور اس کسوٹی کے بعد میں آنے والوں کی تخلیقات کو پرکھا جاتا ہے۔بلاشبہ کرنل محمد خان اپنے عہد کی ایک ایسی ہی کسوٹی ہے جس میں نہ صرف یہ کہ پہلے سے موجود روایت جمع روایات ہو گئی ہیں بل کہ جدید اسلوب سے انھوں نے اس کی خوب صورت تشکیل بھی کی ہے۔انھوں نے "بجنگ آمد"،"بسلامت روی" اور "بزم آرائیاں" کی صورت میں اردو ادب کو سنجیدہ مزاح کے بہترین نمونوں سے مالا مال کیا ہے۔کرنل محمد خان کے اسلوب کی خصوصیات اس کی خیال آفرینی،فکر انگیریزی اور لطافت و شگفتگی ہے جو انہیں دوسرے مزاح نگاروں سے ممتاز کرتی ہے(۱۲)۔افتخار عارف "کرنل محمد خان:شخصیت اور فن" کے پیش لفظ میں رقم طراز ہیں:

> "کرنل محمد خان اردو کے صاحبِ طرز مزاح نگار ہیں۔بجنگ آمد،بزم آرائیاں اور بسلامت روی اردو کے نثری مزاحیہ ادب میں ہمیشہ زندہ رہنے والی کتابیں ہیں۔انہوں نے جو اعلیٰ معیار پہلی تصنیف میں قائم کیا تھا آخری کتاب تک اسے نہ صرف یہ کہ برقرار رکھا بل کہ اردو مزاحیہ ادب کے مقام و مرتبے اور وقار میں بے پناہ اضافہ کیا۔نام ونمود اور شہرت سے دور بھاگنے اور گوشہ نشیں رہنے والے یہ عہد ساز مزاح نگار اس قدر خود دار تھے کہ اس کی مثال شاید ہی کہیں دکھائی دے۔کرنل محمد خان کے بارے میں یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ وہ اردو مزاح نگاری کے نہ صرف رجحان ساز بل کہ بنیاد گزار ادیب تھے۔"(13)

راولپنڈی کلب کرنل محمد خان کا پوسٹل ایڈریس تھا"کرنل محمد خان،پنڈی کلب،راولپنڈی۔کولونیئل عہد کی یاد تازہ کرتی پنڈی کلب کی عمارت جہاں مری بروری سے تازہ کشید کی گئی بیئر کے قدیم چوبی ڈرم براہ راست لائے جاتے تھے۔جس کو دیکھ کر کولونیئل عہد کے ابھی تک زندہ ریٹائرڈ کرنلوں اور جنرلوں اور بیورکریٹس کے بوڑھے چہرے پر رونق ہو جاتے کہ پیاس بجھنے کا سامان میسر ہو گیا۔مستنصر سے ان کی پہلی ملاقات یہی ہوئی جب وہ شفیق الرحمن سے پہلی مرتبہ ملنے کے لیے پنڈی کلب گئے۔یہ ملاقات پہلی اور آخری ثابت ہوئی دونوں اپنی گونہ گو مصروفیات کی وجہ سے نہ چاہتے ہوئے بھی زندگی بھر دوبارہ نہ مل سکے۔البتہ خط کتابت کا سلسلہ عمر بھر جاری رہا۔اس پہلی ملاقات کی منظر کشی کرتے ہوئے مستنصر حسین تارڑ "خطوط:شفیق الرحمن،کرنل محمد خان،محمد خالد اختر" میں رقم طراز ہیں:

> "پنڈی کلب میں۔۔کولونیل عہد کی اخلاقیات آخری سانس لے رہی تھی۔۔اسی پنڈی کلب میں میری پہلی ملاقات اس "جوان رعنا" سے ہوئی جس کا نام کرنل محمد خان تھا۔۔شفیق الرحمن کے ہمراہ انھی کے قد کاٹھ کا ایک وجیہہ شخص،جس کا چہرہ رف اینڈ ٹف تھا۔۔نفاست سے ترتیب دیئے ہوئے گھنے اگرچہ سفید بالوں والا شخص،مونچھیں ترشی ہوئیں،چلا آتا تھا اور یوں چلا آتا تھا کہ دل میں گھر کرتا تھا۔۔اور ان دنوں "بجنگ آمد" کا طبل جنگ کل پاکستان میں گونج رہا تھا۔۔"بجنگ آمد" میری رائے میں جو ناقص نہیں ہے،شگفتہ ادب کی سب سے بڑی کتب ہے۔۔میں اسے اپنی دس پسندیدہ ترین کتابوں میں شمار کرتا ہوں۔۔شفیق الرحمن صاحب نے رسمی حال

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.5 No.4 2021

احوال پوچھنے اور مسلسل مسکرانے کے سوا کچھ نہیں کہا۔ البتہ کرنل صاحب کہنے لگے "مجھے شفیق صاحب نے بتایا کہ آپ آرہے ہیں تو میں بن بلائے چلا آیا۔ میں آپ سے ملنا چاہتا تھا۔۔" ازاں بعد کرنل صاحب نے میرے اولین سفر نامے "نکلے تیری تلاش میں" کی مبالغہ آمیز توصیف کی اور اتنی کی کہ مجھے یقین ہو گیا کہ وہ اپنی حس مزاح پر اتر آئے ہیں، قطعی طور پر سنجیدہ نہیں ہیں۔۔ بعد ازاں کھلا کہ کرنل صاحب کا دل ان کی آبائی لینڈ سکیپ چکوال کی مانند وسیع اور بے ریا ہے اور انہیں اگر کسی میرے ایسے نو آموز مصنف کا ایک فقرہ بھی پسند آجائے تو وہ کل جہان میں اس کا چرچا کرتے ہیں۔ کرنل محمد خان سے نہ صرف یہ میری پہلی بل کہ تقریباً آخری ملاقات بھی تھی کہ اس کے بعد ہمارے درمیان برسوں نہایت باقاعدگی سے خطوط کا تبادلہ تو ہوتا رہا لیکن شدید خواہش کے باوجود ہم دوبارہ کبھی نہیں مل سکے۔۔ کبھی میں راولپنڈی جاتا اور پنڈی کلب پہنچ کر ان کے بارے میں استفسار کرتا تو وہ اپنے گاؤں بل کسر گئے ہوتے اور کبھی وہ لاہور آتے، فون کرتے اور میں مکروہات دنیا میں اتنا غرق ہوتا کہ ملاقات کی نوبت نہ آتی۔۔"(14)

کرنل محمد خان کی پہلی تصنیف "بجنگ آمد" جس نے شائع ہوتے ہی ادبی دنیا میں ہل چل پیدا کر دی۔ یہ کتاب انھوں نے ملازمت کے دوران تخلیق کرنا شروع کی۔ اس کی وجہ سے وہ گم نامی کے اندھیروں سے ایک دم شہرت کی تیز چندھیا دینے والی روشنیوں میں آگئے۔ اردو ادب کے بڑے بڑے نقادوں نے ان کے فن کا لوہا مانا اسی طور مستنصر بھی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور "بجنگ آمد" کے بارے میں "خطوط: شفیق الرحمن، کرنل محمد خان، محمد خالد اختر" میں لکھتے ہیں:

"بجنگ آمد" اردو ادب کا ایک ایسا شاہ کار ہے کہ اس کے سامنے مزاح کی دیگر کائنات ماند پڑ جاتی ہے۔۔ ان کا مزاح مینو فیکچرڈ نہیں ہوتا، اسے کرافٹ نہیں کیا جاتا اور نہ ہی کوئی مزاحیہ صورت حال تخلیق کر کے لفظوں کے ہیر پھیر سے قاری کا گھیراؤ کیا جاتا ہے۔۔ مزاحیہ فقرے قطعی طور پر متوقع نہیں ہوتے۔۔ ان کے کردار، سچوایشن اور اظہار ہمیشہ غیر متوقع ہوتے ہیں اور ان میں کہیں بھی تصنع، بناوٹ یا کاریگری کا شائبہ نہیں ہوتا۔۔ شاید اسی لیے کہ "بجنگ آمد" لکھتے ہوئے انہیں نہ زبان کا اور نہ ہی کمال بیان کا کوئی زعم تھا، انہوں نے یہ کتاب بقول کسے صرف رانجھا راضی کرنے کے لیے لکھی اور اس کی مقبولیت اور پذیرائی نے انہیں بھی حیران کر دیا کہ دنیائے ادب میں جتنے بھی رانجھے تھے وہ سب اپنی تصنیفات، اپنی ہیریں بھول گئے اور کرنل محمد خان سے راضی ہو گئے۔"(15)

عہد حاضر کے سب سے بڑے نثر نگار مشتاق احمد یوسفی، مستنصر بھی جن کی تحریروں کا ورد کیا کرتے تھے۔ بقول ان کے محمد خالد اختر نے یوسفی کی کتاب "زرگزشت" کے بارے میں ایک عجیب سا فقرہ لکھ گئے کہ "زرگزشت" کے ہر صفحے سے موم بتی اور پسینے کی بو آتی ہے(16)۔ اس فقرے سے اس بات کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ وہ اپنی کتاب پر کس قدر محنت کیا کرتے۔ اس کی نوک پلک سنوارنے کی غرض سے برسوں محنت کرتے تب جا کر وہ تصنیف کاملیت کا درجہ حاصل کر پاتی۔ اس کے برعکس کرنل محمد خان نے یہ کتاب صرف اپنا رانجھا راضی کرنے کی غرض سے تحریر کی اور شہرت کی بلندیوں کو چھو لیا۔ ادب میں بے شمار ایسے تخلیق کاروں کی مثال پیش کی جاسکتی ہے جنھوں نے اپنی تمام عمر تخلیقی کام کے لیے وقف کر دی لیکن اس کے باوجود وہ گم نام رہے کسی بھی جگہ انہیں اپنا تعارف کروانا پڑتا ہے۔ "بجنگ آمد" نے اس کے مقابلے میں کرنل محمد خان کو مقبولیت کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ "بجنگ آمد" کے اشاعت سے جو خوش بختی ان کے حصّہ میں آئی وہ دراصل خوشی بختی نہیں تھی بالکل ایک بد قسمتی تھی جس کو بیان کرتے ہوئے مستنصر حسین لکھتے ہیں:

"اس پہلی کتاب کے بعد وہ مصنف جو کچھ بھی ضابطہ تحریر میں لائے، بے شک اس کتاب سے کہیں بلند درجوں پر فائز کوئی تحریر لے آئے اس کی پذیرائی نہیں ہوتی۔۔ پڑھنے والے اس کی پہلی کتاب کے طلسم میں ایسے گرفتار ہوتے ہیں کہ وہ اس محبوبہ کے بعد کسی اور سے کہیں خوش نظر اور خوش صورت محبوبہ کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے، عبداللہ حسین کے ساتھ "اداس نسلیں" کے بعد یہی ٹریجڈی ہوئی۔۔ قرۃ العین حیدر نے "آگ کا دریا" کے بعد "آخر شب کے ہم سفر" اور گردش رنگ چمن" ایسے عجائب ناول لکھے لیکن "آگ کا دریا" ایک پیر تسمہ پا کی مانند ان سے چمٹا رہا۔ ایسی بے شمار مثالیں ہیں جن کا تذکرہ طویل ہو جائے گا۔۔ کرنل محمد خان کے ساتھ بھی یہی سانحہ ہوا۔۔ انہوں نے "بزم آرائیاں" اور خاص طور پر "بسلامت روی" ایسی لازوال تحریریں قلم بند کیں لیکن

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.5 No.4 2021

"بجنگ آمد" نے ایک سون کی مانند انہیں گہنا دیا۔۔ کرنل محمد خان کے ساتھ بھی یہی ٹریجڈی ہوئی "بزم آرائیاں" اور " بہ سلامت روی"، شگفتگی اور مزاح آرائی میں لاجواب تھیں لیکن قاری "بجنگ آمد" کے عشق میں فنا ان کی فنی عظمت سے بے خبر رہا۔۔"(17)

شفیق الرحمن اور کرنل محمد خان کی درپردہ دوستی سے بہت کم لوگ آشنا تھے۔ انھوں نے اپنی گہری یگانگت اور قربت کو کسی پر ظاہر نہ ہونے دیا۔ دونوں نے پھرپور زندگی بسر کی وہ نہ صرف مردانہ وجاہت اور خوش لباسی میں ایک تھے بل کہ دونوں مزاح اور شگفتگی میں کمال رکھتے تھے اور دونوں نے دوسری جنگ عظیم میں بھی شرکت کی۔ دونوں ہفتہ وار ایک طے شدہ مقام پر تمام ادبی و سرکاری مصروفیات کو چھوڑ کر نہایت تردد سے تیار ہو کر ملاقات کرتے تھے۔ شفیق الرحمن کی موت نے یہ منظر تبدیل کر دیا مستنصر خطوط: شفیق الرحمن، کرنل محمد خان، محمد خالد اختر" میں لکھتے ہیں:

"شفیق صاحب کی موت کے بعد کرنل صاحب تنہا رہ گئے۔۔ ایک ہنسوں کا جوڑا تھا جو بچھڑ گیا۔۔ کہا جاتا ہے کہ کرنل صاحب ہفتے کی اس مخصوص شب حسب معمول پرا پرلی ڈریسڈ ہو کر۔۔ بے شک سیاہ سوٹ زیب تن کر کے، ٹائی کی گرہ انگریزوں کی مانند ایسے باندھتے تھے کہ گرہ تکون میں ایک کروٹ ہوتی، اپنے سفید بالوں کو سنوار کر۔۔ مونچھیں ترشوا کر اور ان کے سیاہ بوٹ ہمیشہ دمکتے اور لشکتے ہوئے اور وہ یوں بن سنور کر تنہا بیٹھ جاتے۔۔ وہ شفیق صاحب کے چلے جانے پر بجھ گے گئے، ان کی شبوں کا رفیق اپنے جو گرز کے کھلے تسموں سمیت پنڈی کے ایک قبرستان میں منتقل ہو گیا تھا۔۔ وہ شفیق صاحب کے جانے کے بعد زیادہ دیر نہ جیے۔۔"(18)

کرنل محمد خان اپنے رفیق کی جدائی زیادہ دیر برداشت نہ کر سکے۔ ان پر ایک مشکل اور پیش آئی کہ بڑھاپے کی وجہ سے ان کے دانت گر گئے۔ انھوں نے اس کمی کو پورا کرنے کے لیے مصنوعی دانتوں کا سہارا لیا لیکن وہ ان کو منھ میں رکھنے کی اذیت کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے اپنے دوستوں سے ملنا ملانا ترک کر دیا ۔جب کہ دوسرا ظلم جو ان کے اپنے سگے بیٹے نے ان پر کیا اس کا بیان مستنصر حسین تارڑ "خطوط" میں یوں کرتے ہیں:

"آخری عمر میں ان پر ایک ایسا ظلم ہوا جسے اس جنگ عظیم کے نڈر جنگجو کے لیے بھی سہنا ممکن نہ تھا۔۔ انہوں نے زندگی بھر کی جمع پونجی اور پنشن کے بقایا جات سے راولپنڈی میں ایک گھر تعمیر کیا اور اولاد کی الفت میں ایسے مبتلا ہوئے کہ گھر ان کے نام کر دیا اور اپنے لیے صرف ایک مختصر کمرہ مخصوص کیا۔۔ شنید ہے کہ ان کے سگے بیٹے نے انہیں یوں بے گھر کیا کہ اس کے سالوں نے بوڑھے کرنل محمد خان پر تشدد کر کے انہیں گھر سے نکال دیا۔۔ کرنل صاحب اس صدمے سے سنبھل نہ سکے۔۔ اپنے آبائی گاؤں بل کسر چلے گئے اور مر گئے۔۔ کبھی کبھار جب میڈیا کو ان کی ادبی عظمت کا احساس ہوتا تو بل کسر کے دور افتادہ دھول بھرے قبرستان میں ان کی قبر کا کتبہ سکرین پر نمایاں ہوتا ہے۔۔ "کرنل محمد خان۔۔ "بجنگ آمد" کے مصنف۔۔"(19)

اردو مزاح نگاری کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو کرنل محمد خان کا فن اپنی سنجیدہ روی کی وجہ سے مزاح کے نئے پیمانے متعین کرتا ہے۔ جس کے معیار پر بعد میں آنے والے مزاح نگاروں کے فن کو تولہ جا سکے گا۔ انھوں نے "بجنگ آمد"، "بسلامت روی" اور " بزم آرائیاں" کی صورت اردو کو سنجیدہ مزاح سے روشناس کروایا۔ خیال آفرینی، فکر انگیزی اور شگفتگی و سنجیدہ لطافت انھیں ادب میں ممتاز مقام عطا کرتا ہے جو کسی اور مزاح نگار کے حصے میں نہ آ سکا۔ انھوں نے "بجنگ آمد" سے شہرت کی جو بلندیاں حاصل کی اس کی تیز روشنی میں "بسلامت روی"، "بزم آرائیاں" کی روشنی ماند پڑ گئی۔ اس تمام تر شہرت کے باوجود وہ قسمت کے ہاتھوں جیت نہ سکے زندگی کے آخری حصے میں اپنے ہی بیٹے کے ہاتھوں جس ذلت کا سامنا کرنا پڑا وہ اسے برداشت نہ کر سکے۔ مزاح کا یہ جنرل رومیل طویل علالت کے بعد اپنے خالق حقیقی سے جاملا اور اپنے گاؤں بلکسر کے ایک قبرستان میں دفن ہو گیا۔ ان کے موت سے اردو ادب میں سنجیدہ مزاح کا ایک باب بند ہو گیا۔

اپنی تحریروں سے معاشرے کی اعلیٰ اقدار کا گلا گھونٹتے رجحانات اور رویوں پر تنقید کرنے والے معروف نقاد، مزاح نگار اور افسانہ نگار محمد خالد اختر کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ وہ اپنے حساس قلم سے معاشرتی تصنع، بناوٹ، ظاہری رکھ رکھاؤ یا جھوٹا فخر و غرور بیان کرتے ہوئے کسی مصلحت اندیشی سے کام نہیں لیتے بل کہ اصلیت کو بیان کرتے ہیں۔ اردو کی ایسی ہمہ جہت شخصیت کہ جس کے طنز میں گہرائی بھی ہے اور گیرائی بھی ہے انھوں نے اپنی ساری زندگی جہان فکر و دانش کے در و بام تعمیر کرنے اور سجانے میں گزار دی۔ انھوں نے اپنی تخلیقی قوتوں کو بروکار لاتے ہوئے اردو ادب کو ایک نئے رنگ و آہنگ سے روشناس کروایا۔ ۱۹۵۰ء میں انھوں نے چارج اروپل کی "نائنٹین ایٹی فور" کی تقلید میں "بیس سو گیارہ" لکھی جس میں اردو میں ایک نئی صنف متعارف کروانے کے ساتھ ساتھ مغربی معاشرت پہ واضح اور گہری طنز بھی نظر آتی ہے۔ انھوں نے

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.5 No.4 2021

اپنے خیالات کو مغرب سے اخذ کیا اور اردو ادب میں نئے انداز سے پیش کر دیا۔ "نکلے تیری تلاش میں" نے مستنصر حسین تارڑ کو شہرت کی جن بلندیوں پر پہنچا دیا اس کے پیچھے کچھ نہ کچھ ہاتھ محمد خالد اختر کا بھی تھا۔ دونوں کی کوئی رسمی ملاقات تو نہ تھی لیکن مستنصر ان کی تحریروں کے مداح تھے۔ وہ خطوط: شفیق الرحمن، کرنل محمد خان، محمد خالد اختر" میں لکھتے ہیں:

"جیسے ٹرائے کی ہیلن کا دلوں کو مسخر کرنے والا چہرہ ایسا تھا کہ اس چہرے نے ہزاروں جنگی جہاز سمندروں میں اتار دیئے۔ ایسے ہی میرے پہلے سفر نامے "نکلے تیری تلاش میں" پر اولین اور طویل تبصرہ جو محمد خالد اختر نے "فنون" میں لکھا ایک ایسا چہرہ تھا جس نے میرے نو آموز ادبی کیریئر کو شہرت کے سمندروں پر رواں کر دیا۔۔ میں اپنی بیجوں کی دکان کسان اینڈ کمپنی میں بیٹھا خالد صاحب کے تبصرے کی تخلیقی قوت سے گم نامی کے اندھیروں میں سے نکل کر یک دم ادب کی تیز روشنیوں میں آگیا اور میں اس محمد خالد اختر کو جانتا تک نہ تھا۔۔ کبھی ملاقات نہ ہوئی تھی البتہ "فنون" میں شائع ہونے والی ان کی انوکھی اور دیگر نثر نگاروں سے یکسر مختلف نثر کا مداح بہ ہر حال میں ہو چکا تھا۔۔ مجھے ہمیشہ احساس ہوتا کہ ان کی مزاح اور تحریر کی بے باکی جی وڈہاؤس کی قربت میں ہے اور میں وڈہاؤس کا اتنا شیدائی ہوا کرتا تھا کہ ان کی "جیوز" سیریز کی درجنوں کتابیں چاٹ چکا تھا۔۔ اکثر مجھے شائبہ ہوتا کہ یہ شخص سوچتا انگریزی میں ہے اور پھر اس کا سلیس ترجمہ اردو میں کر دیتا ہے۔۔ میری پہلی چند کتابوں کا بھی یہی معاملہ تھا۔۔ اوائل عمری میں انگلستان میں طویل قیام نے اور انگریزی ادب کے ساتھ زندگی کی اکثر راتیں بسر کرنے نے مجھے اردو کے حوالے سے قدرے اپاہج کر دیا تھا۔۔ میں نے کم از کم اپنی پہلی کتاب کے لیے انگریزی اردو لغت پر گہرا انحصار کیا۔۔ بہت سے نقادوں نے میرے "منفرد" اور "نئے" اسلوب کی توصیف کی جو کہ نہ تو منفرد تھا اور نہ ہی نیا بل کہ انگریزی سے ترجمہ شدہ اظہار تھا۔۔ شاید خالد صاحب کو میری یہی کج ادائی بھا گئی۔" (20)

محمد خالد اختر سے ان کی پہلی ملاقات "فنون" کے دفتر میں ہوئی۔ یہ ان کی شناسائی کی ابتدا تھی جو اگلے تیس پینتیس برسوں میں مزید گہری دوستی اور شفقت میں تبدیل ہو گئی۔ مستنصر حسین تارڑ "خطوط: شفیق الرحمن، کرنل محمد خان، محمد خالد اختر" میں اس ملاقات کا حال بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"شاید یہ حسین شاہد تھا جو مجھے ایک روز انار کلی میں واقع "فنون" کے دفتر لے گیا۔ وہاں احمد ندیم قاسمی اور عبداللہ قریشی کی میزوں کے بلمقابل کرسیوں پر کچھ لوگ بیٹھے کبھی کسی سنجیدہ علمی بحث میں غرق ہو جاتے اور کبھی لطیفوں کا دور چلنے لگتا۔۔ ایک کونے میں دبکا۔۔ ایک جیل سے فرار ہونے والے مفرور کی مانند دبکا ہوا شخص، منحنی، دراز قامت، ایک فاقہ کش کشمیری ہاتو اگر اس کا رنگ ذرا نکھرا ہوتا تو۔۔ ایک ٹیڑھا میڑھا شخص جس کی ناک قدرے بل کھاتی ہوئی لگتی تھی۔۔ آنکھیں دھنسی ہوئیں، کھوپڑی پر ماس کسا ہوا وہ شخص چائے کی پیالی وصول کرنے کے لیے اپنی نشست سے اٹھا تو قدرے کُبڑا لگتا تھا لیکن اس کی کمر میں یہ خم اس کی کہولت کے باعث نہ تھا، حد درجہ انکساری تھی جو اسے پورے قد سے کھڑے ہونے کی راہ میں حائل ہوتی تھی، اس کا ڈھیلا ڈھالا کوٹ اور نامعلوم کو لہوں پر سے کھسکتی پتلون اس کے بدن کے ناتواں ڈھانچے کے ہینگر پر بے بسی سے لٹکتے تھے۔۔ اس نے کسی بھی بحث میں حصہ نہ لیا، دبکا بیٹھا رہا، کبھی کبھار وہ کچھ غوں غاں سی کرتا اور پھر خاموش ہو جاتا۔ اس دوران اس نے لرزتے ہاتھوں سے کوٹ کی جیب میں سے سگریٹوں کا ایک پچکا ہوا پیکٹ نکالا، اسے کھول کر سگریٹوں پر کانپتی ہوئی انگلیاں چلائیں اور بہ مشکل ایک سگریٹ بر آمد کر کے فوری طور پر اسے اپنے باریک ہونٹوں کے درمیان میں بھینچ لیا۔ اگلا مرحلہ ظاہر ہے سگریٹ کو سلگانے کا تھا۔ ماچس کی ڈبیایں سے بھی وہ ایک تیلی قابو میں ہی نہ آتی تھی جس نے اسے سلگانا تھا۔۔ خدا خدا کر کے یہ ہفت خواں بھی طے ہوا۔۔ اب خالد صاحب کی تیکھی اور بل کھاتی ناک بار بار ماچس کی بھڑکتی لو کے آڑے آتی۔۔ اور وہ اپنا رخ بدل کر اسے جھلنے سے بچانے کا چارا کرتے۔۔ بالآخر جو سگریٹ سلگا وہ بھی خالد صاحب کی مانند بجھا بجھا ہوا سلگا۔۔ آئندہ تقریباً چالیس برسوں کی رفاقت اور ان کی مہربانیوں کے دوران سب سے پر لطف لمحہ وہی ہوتا جب وہ سگریٹ سلگانے کی کوشش کرتے اور اپنی ناک کو نذر آتش ہونے سے بہ مشکل بچاتے۔۔" (21)

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.5 No.4 2021

محمد خالد اختر، مستنصر حسین تارڑ کی ادبی زندگی کا ایک معتبر اور مستقل حوالہ بن گئے تھے۔ انہوں نے "نکلے تیری تلاش میں" کے بعد "اندلس میں اجنبی" اور افسانوں کے مجموعے "سیاہ آنکھ میں تصویر" کے بارے میں "فنون" میں تفصیلی ریویو لکھے جن میں ان کتابوں کی خوبیوں کے پہلو بہ پہلو ان پر خوب تنقید بھی کی گئی تھی۔ جب دونوں پہلی مرتبہ آمنے سامنے ہوئے تو خالد اختر نے ان ریویو پر معذرت چاہی جس کے بارے میں مستنصر "خطوط: شفیق الرحمن، کرنل محمد خان، محمد خالد اختر" میں لکھتے ہیں:

> "مجھے یاد نہیں کہ یہ قاسمی صاحب تھے جنھوں نے خالد صاحب سے میرا تعارف کروایا۔۔ یا پھر محفل کے برخاست ہونے پر میں نے خود ان کے قریب ہو کر اپنا نام بتایا تھا۔۔ لیکن مجھے یہ یاد ہے کہ خالد صاحب کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا جیسے وہ کسی جرم کے ارتکاب میں پکڑے گئے ہوں اور انھوں نے ہکلاتے ہوئے کہا "آپ۔۔ یقیناً مجھ سے ناراض ہوں گے۔۔" دراصل خالد صاحب کے ریویو میں جہاں انہوں نے میرے انداز کی حد درجہ توصیف کی تھی کہ مستقبل میں سفر نامہ نگاروں کو تارڑ ترکیب کو بروئے کار لانا پڑے گا وہاں انہوں نے کہیں کہیں مجھے لتاڑا بھی تھا۔۔ میری نثر کی نیت پر شک کرتے ہوئے مجھے اپنے لطیف طنز کا نشانہ بھی بنایا تھا۔۔ اور میں ان کی تنقید سے بھی لطف اندوز ہوا تھا کہ مجھ ایسے نووارد کو خالد صاحب اپنے طنز کے قابل بھی سمجھیں تو یہ بھی اعزاز سے کم نہ تھا۔۔ "نہیں سر" اور پھر میں صدق دل سے اس ریویو کے لیے ان کا شکریہ ادا کیا۔۔ "عبداللہ حسین مجھ سے سخت ناراض ہے۔" وہ بوکھلائے ہوئے سے بولے۔ "میں نے ان کے ناول "اداس نسلیں" پر "فنون" میں تبصرہ کیا تو کسی نے بتایا کہ وہ مجھ سے خفا ہوئے ہیں۔۔ اکثر ادیب میرے تبصروں سے ناراض ہو جاتے ہیں۔۔ آپ کا سفر نامہ "نکلے تیری تلاش میں" ایک نیئر ماسٹر پیس ہے اگرچہ شفیق الرحمن کے رنگ میں نگاہوا ہے۔۔ آپ ارغوانی ٹکڑے ٹانکنے سے باز نہیں کبھی آتے اور مجھے کبھی شائبہ ہوتا ہے کہ آپ اپنے بیانیے میں فکشن کی آمیزش کرتے ہیں۔۔" وہ مزید شرمندہ ہو کر کہنے لگے اور ان کی انگلیوں میں دابے ہوئے سگریٹ کی راکھ فرش پر گرنے لگی "دراصل میں بھی ایٹ ہارٹ ایک ویگابانڈ ہوں، ادیب وغیرہ نہیں ہوں۔ بچپن میں گھر سے بھاگ گیا اور ہندوستان بھر میں آوارہ گردی کرتا رہا۔۔ بہت دربدر ہوا لیکن آپ جیسا سفر نامہ نہ لکھ سکا۔۔ ویل ڈن۔۔"(22)

محمد خالد اختر کی زندگی کے چار حصے ہیں۔ پہلا حصہ جو بہاولپور کے صادق گڑھ پبلک سکول میں زیر تعلیم تھے جہاں انھوں نے نوجوان احمد ندیم قاسمی کو شاعری کے علاوہ افسانہ نگاری کی جانب مائل کیا۔ یہیں کہیں شفیق الرحمن سے ان کی طویل رفاقت کا آغاز ہوا اور پھر وہ لاہور چلے آئے اور واپڈا ہاؤس کی ایڈورڈسٹون ایسے ماہر تعمیرات کی ڈیزائن کردہ عمارت میں محمد کاظم کے رفیق رہے۔ ملازمت سے ریٹائرمنٹ پر وہ واپس بہاول پور چلے گئے۔ مستنصر کو جب "بہاؤ" ناول کے زمانے میں ایسی تصوراتی لینڈ سیکپ درکار تھی جو صرف بہاول پور ایسے شہر میں میسر آسکتی تو ایک موقع کو غنیمت جانتے ہوئے وہ بہاول پور پہنچے، جہاں وہ محمد خالد اختر کے ساتھ چند دن گزار سکے۔ وہ "خطوط: شفیق الرحمن، کرنل محمد خان، محمد خالد اختر" میں لکھتے ہیں:

> "یہ وہی زمانے تھے، وہی دن تھے جب اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور کے چند طالب علم خصوصی طور پر لاہور آئے اور مجھے یونیورسٹی کے ایک سالانہ جلسے کی صدارت کے لیے مدعو کیا۔ میں نے اس شرط پر ہامی بھر لی کہ وہاں میرے قیام کے دوران کم از کم ایک دن ایسا ہو گا جب آپ میرے لیے جیپ مہیا کریں گے جو مجھے چولستان کے صحرا میں دریائے گھاگھرا۔۔ یا خشک ہو چکے داستانوی دریا سرسوتی کی گزرگاہ تک لے جائے گی اور واپس چلی جائے گی تاکہ میں مکمل تنہائی میں اس خشک دریا کے ان زمانوں کو تصور کر سکوں جب وہ بہاؤ میں تھا کہ میں ان دنوں اپنا ناول "بہاؤ" لکھ رہا تھا اور مجھے اس صحرائی لینڈ سکیپ کی کچھ تصوراتی لینڈ سکیپ درکار تھی۔ اس کے علاوہ میں نے مطالبہ کیا کہ آپ لوگوں کے ہاں محمد خالد اختر رہتے ہیں تو ان کو کھوج لگانا ہے۔۔ مجھے ان سے ملنا ہے۔۔ اور وہ بھی کیا ہی نشاط آور صحرا کی جانب سے اپریل کے مہینے میں کروٹیں بدلتی، اٹھلاتی اور رخساروں پر نیم سرد بوسے ثبت کرتی بہاول پوری شب کی ہوا تھی جس میں اس صحرائی شہر میں بچھے چوڑے اور ویران راستوں پر ایک ایسی کار آہستگی سے محو خرام تھی جس میں برابر کی نشست پر محمد خالد اختر براجمان تھے اور وہ بار بار میرے بازو پر اپنی ہتھیلی رکھ کر کہتے "تارڑ تم نے مجھے یاد رکھا شکریہ۔۔ مجھے تو کوئی بھی یاد نہیں رکھتا۔۔ میں

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.5 No.4 2021

تمہیں کیا بتاؤں کہ مجھے کتنی خوشی ہوئی جب مجھے معلوم ہوا کہ تم بہاول پور آئے ہو اور مجھے تلاش کر رہے ہو۔" اور پھر وہ سگریٹ سلگانے کی کوشش میں اپنی ناک کی پھننگ کو تقریباً جھلسانے لگتے تو میں ان کا سگریٹ سلگا دیتا اور وہ کہتے۔۔ تھینک یو ینگ مین۔"(23)

بہاول پور قیام کے دوران وہ محمد خالد اختر کے قریبی دوستوں اقبال اور چغتائی صاحب سے ملے اور بہاول پور کے معلوماتی چکر پر انہیں مشہور جگہوں کی سیر کروائی۔ رات کو ان کے ریسٹ ہاؤس پر قتیل شفائی ایک محفل آراستہ کیے ہوئے تھے جس میں چند نوخیز خواتین منھ کھولے نہایت اشتیاق سے ان کا کلام سنتی تھی۔ بہاول پور قیام اور خالد صاحب سے ملاقات ان کی زندگی کی حسین یاد ہے۔ مستنصر سے معاصرانہ چشمک رکھنے والے ادیبوں نے باقاعدہ منصوبہ بند مہم کے تحت ان کے جن قریبی دوستوں کو بدگمان کرنا شروع کیا ان میں محمد خالد اختر کا نام سرفہرست تھا۔ ان ادیبوں کا طریق واردات یوں تھا کہ وہ اپنے شکار کو محفل سے الگ کرتے اور پھر نہایت سنجیدگی سے سرگوشیاں کرتے کہ آپ تو تارڑ کی تحریر اور شخصیت کے مداح ہیں لیکن وہ محفل میں آپ کا ذکر کرتے ہوئے طنزیہ انداز اپناتا ہے۔ محمد خالد اختر پر ان سرگوشیوں کا سب سے زیادہ اثر ہوا اور وہ اپنی سرد مہری کو چھپا نہ سکے اور اس کا غصے بھرا اظہار انھوں نے مستنصر پر مضامین لکھ کر کیا۔ وہ "خطوط" میں اس واقع کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"ایک سویر ایسی آتی ہے کہ محمد خالد اختر بھی واضح طور پر سرد ہو گئے، بے رخی اختیار کر لی اور مجھے سے اجتناب کرنے لگے۔۔ میں حسب معمول مسکراتے ہوئے ان کا سگریٹ سلگانے کی پیش کش کرتا تو وہ ایک گہری "اونہہ" کر کے منھ پرے کر لیتے۔۔ وہ ایسے شخص نہ تھے کہ اپنے چہرے سے ظاہر ہوتی ناگواری پر قابو پا سکتے۔۔ اور منافقت سے کام لیتے ہوئے میرے ساتھ وہی دوستانہ سلوک روا رکھ سکتے۔۔ بل کہ نھوں نے "نوائے وقت" کے ایک کالم میں نہ صرف مجھے بل کہ میری تحریروں کو بھی بری طرح کوریدا اور ظاہر ہے مجھے بہت دکھ ہوا لیکن میں تو آگاہ تھا کہ اس زہرناکی کے پردے میں کیا کیا روپوش ہے۔۔ سچی بات ہے مجھے ٹھیک طرح سے یاد نہیں کہ یہ "فنون" کا دفتر تھا یا شاید جمیلہ ہاشمی کے ہاں ایک محفل جب میں نے خالد صاحب کو کارنر کر لیا۔۔ اور میرا لہجہ قدرے تلخ تھا۔ "خالد صاحب۔۔ آپ بے شک مجھ سے روٹھے رہیں، عمر بھر مجھ سے کلام نہ کریں لیکن اس سرد مہری کا کوئی جواز ہے تو کم از کم مجھے آگاہ کر دیں۔ اور پھر مجھے بھی کچھ پروا نہیں کہ آپ کبھی مجھ سے کلام کرتے ہیں یا نہیں۔" خالد صاحب نے پہلے تو اس گوشے سے "غوں غاں" کر کے فرار ہونے کی کوشش کی جہاں میں انھیں گھیر کے لے آیا تھا اور پھر اپنے اٹکتے ہوئے لہجے میں کہنے لگے۔۔ "بھلا مجھے آپ سے کیا شکایت ہو سکتی ہے۔۔ میں نے ایک زمانے میں آپ کی تحریر کو بہت سراہا تھا لیکن ان دنوں میں نے جو کچھ آپ کے بارے میں لکھا ہے، وہ میرے دل کی آواز ہے۔ اگر میں آپ کو ایک بودا ادیب سمجھتا ہوں تو میں کیوں نہ اس کا اظہار کروں۔"

"درست۔۔" میں نے سر تسلیم خم کر دیا۔ "اگر آپ اتنی توصیف کے بعد مجھ پر تنقید کرتے ہیں تو مجھے یہ بھی قبول ہے۔ صرف اتنا بتا دیجیے کہ اس سرد مہری کا سبب۔۔ اور یہاں میں نے دو ہم عصر ادیبوں کے نام لیے۔۔۔ ان حضرات کی سرگوشیاں تو نہیں۔۔" خالد صاحب اپنے چہرے کے تغیر پر قابو نہ پا سکے۔۔ میرے اصرار کے دباؤ کو وہ سہار نہ سکے اور کہنے لگے۔۔ نہیں نہیں۔۔ لیکن کیا آپ نے مجھے ایک محفل میں بل کہ ایک ادبی پرچے کے دفتر میں میری شخصیت کا مذاق اڑاتے ہوئے یہ نہیں کہا تھا کہ محمد خالد اختر ایک پاگل بوڑھا ہے۔۔۔ "خالد صاحب میں نے بے شک آپ کو ایک پاگل بوڑھا کہا تھا۔"

"تخلیق" کے دفتر میں براجمان قہقہوں اور لطیفوں اور نسوانی بے حجابی کے قصّوں کے درمیان مجھ سے پوچھتے ہیں کہ یا تارڑ خالد صاحب کی اس تازہ تحریر کے بارے میں تم کیا کہتے ہو۔۔ اور میں سنجیدگی سے جواب دیتا ہوں۔۔ "ایسی تحریر اردو کا کوئی اور ادیب نہیں لکھ سکتا۔۔ اسے صرف محمد خالد اختر ایسا خبطی شخص ہی لکھ سکتا ہے۔ اس بیان کے دوران خالد صاحب صرف "اچھا۔۔ اچھا" کہتے رہے۔۔ ان کی سرد مہری فوری طور پر رخصت ہو گئی اور شاید انہوں نے مجھے اپنا اگلا سگریٹ بھی سلگانے دیا۔۔ میرے نام ان کے چند خطوط گواہی دیں گے کہ وہ مجھے اپنی عمر کے آخری حصے میں کتنا عزیز جانتے تھے اور مجھ سے دل کی باتیں کہتے تھے۔"(24)

محمد خالد اختر دھیمے مزاج اور نہایت وضع دار شخصیت کے مالک تھے۔ ایک نہایت حساس انسان کہ جس کا تعلق ایک خوش حال گھرانے سے ہونے کے باوجود اس کی زندگی نہایت اداسی اور بے چینی میں گزری۔ بچپن ہی سے انسان، فطرت اور شعر و ادب سے محبت کرنے والا شخص جس نے اپنے والدین کی خواہشات کہ پیش نظر خود کو مشینی

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.5 No.4 2021

زندگی میں دھکیل دیا۔وہ زندگی کے کسی بھی مرحلے میں متفق و مطمئن نہ ہو سکے اور ساری زندگی پریشاں حالی میں مبتلا رہے۔ان کی تحریروں سے دھرتی کے سادہ، معصوم اور فطری لوگوں اور چیزوں سے محبت عیاں ہوتی ہے۔کہنے کو تو وہ زندگی بھر مزاح لکھتے رہے لیکن ان کی زندگی اور مزاح میں غم کا ایک گہرا اور شدید احساس رچ بس چکا تھا جو ان کی مزاحیہ تحریروں کے باطن سے اب بھی دکھائی دیتا ہے۔انھوں نے زندگی کے آخری حصے میں لکھنا چھوڑ دیا تھا اور وہ دنیاداری سے تقریباً کٹ چکے تھے اور دنیا سے اسی کنارہ کشی کے دوران وہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

عبداللہ حسین نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کہانی لکھنے سے شروع کیا لیکن ان کو شہرت ناول " اداس نسلیں " سے ملی۔ان کی یہ بدقسمتی تھی کہ "اداس نسلیں" کی شہرت ان کی دوسری تصانیف کی اہمیت کو کھا گئی۔عبداللہ حسین سے مستنصر کی دوستی چالیس سال کے طویل عرصے پر محیط ہے۔وہ عبداللہ حسین کو پاکستان کا سب سے بڑا ناول نگار اور ساتھ ہی ساتھ "اداس نسلیں" کو سب سے بڑا ناول مانتے ہیں۔مستنصر نے "عبداللہ حسین۔۔اُسے اپنے سائز کا نقاد بھی نہیں ملا" کے عنوان سے ایک کالم بھی لکھا جو تارڑ نامہ میں شامل ہے۔جس میں عبداللہ حسین کے بارے میں نقادوں کے رویے سے قارئین کو آگاہ کیا گیا ہے۔"عبداللہ حسین" کے عنوان سے لکھے گئے اس خاکہ میں مستنصر نے ان کے زندگی اور شخصیت کے مختلف پہلوؤں کی بازیافت کی ہے۔انھوں نے عبداللہ حسین کی موت کے بعد ان کا خاکہ صفحہ قرطاس پر اتارنے کی سعی کی اور ان کی شخصیت، حالات اور واقعات کے بیان سے قارئین کے لیے عبداللہ حسین کی شخصیت فہمی کو آسان بنایا ہے۔اس خاکہ میں عبداللہ حسین کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی۔اس خاکے میں جہاں عبداللہ حسین کے شعور و فکر کی خوبیاں دکھائی دیتی ہیں وہیں ان کی خامیوں کو بھی آشکار کیا ہے۔عبداللہ حسین کا خاکہ ایک تصویر ہے جو انھوں نے اپنی یادداشتوں کے سہارے پر مصور کی ہے۔عبداللہ حسین سے پہلی ملاقات کا واقعہ خاصا طویل اور دلچسپ ہے:

> "یہ الفلاح بلڈنگ میں، کشور ناہید کے نیشنل سنٹر میں، مرے ناولٹ "فاختہ" کی تقریب رونمائی کے بعد ہم کشور کے دفتر میں بہت پر مسرت جمع تھے۔انور سجاد دیر سے آیا تھا چناں چہ اس نے احمد ندیم قاسمی سے مخاطب ہو کر، کہ وہ اس تقریب کے صدر تھے، اپنا مضمون پڑھا۔منو بھائی، بانو قدسیہ بھی مضمون نگاروں میں تھے اور جب چائے پیش کی جا رہی تھی تو میں نے دیکھا کہ ایک غیر ملکی دکھائی دیتا شخص، نفاست سے کٹی فرنچ کٹ داڑھی، لباس از حد نفیس، اپنے سلگتے ہوئے پائپ کو اپنے چہرے کے عین سامنے معلق کیے اور اس پائپ میں سے مہکتی ایرن مور تمباکو کی خوش بو چالیس برس کے زمانوں میں مہکتی مجھ تک آتی تھی۔۔۔نیشنل سنٹر میں ایک کرسی پر براجمان اس غیر ملک دکھتے شخص کو البتہ عمدہ اخلاقیات کے بارے میں کچھ زیادہ شعور نہ تھا اور وہ نہایت بدتہذیبی سے اپنی ٹانگیں یوں پھیلائے بیٹھا تھا کہ جو کوئی بھی ادھر سے گزرتا وہ ٹھوکر کھاتا جس پر وہ نہایت برطانوی، بالائی ہونٹ کو اکڑا کر ایک متروک شدہ وکٹورین لہجے میں، کہتا: " آئی ایم سوسوری اور اس کے باوجود اپنی ٹانگیں نہ سکیڑتا۔یہ اس کی ضرورت سے زیادہ دراز قامتی کی مجبوری تھی۔البتہ جب وہ یک دم مجھ سے مخاطب ہوا تو ٹھیٹھ پنجابی لہجے میں مخاطب ہوا:"جناب عالی! میں نے آپ کا ناولٹ "فاختہ" پڑھا ہے۔ لوجی، آپ نے تو بڑا کمال کا ناولٹ لکھا دیا ہے۔"
>
> اپنی تحریر کی توصیف سن کر میں نے فوراً فیصلہ کیا کہ یہ تو ایک نہایت عمدہ انسان ہے، تو میں نے شکریہ ادا کرنے کے بعد پوچھا کہ آپ کو اس سے پیش تر کسی ادبی محفل میں نہیں دیکھا، آپ کا کیا شغل ہے؟
>
> "میں، جناب عالی! انگلستان میں قیام پذیر ہوں۔ویسے لائل پور کا رہنے والا ہوں۔"
>
> "لیکن آپ کو ادب میں بھی کچھ دلچسپی ہے؟"
>
> "دراصل، جناب عالی! میں نے بھی تھوڑا بہت لکھا ہے۔چند کہانیاں اور ایک ناول "اداس نسلیں!" اس کے اس اقرار میں تکبر نہ تھا بل کہ کچھ شرمندگی تھی۔
>
> "آپ عبداللہ حسین ہیں؟اس نے سر ہلایا تو میں اپنی نشست سے اٹھ کر اس کے قریب ہو بیٹھا اور اس کے گھٹنے تھام کر کہا:"یقین کیجیے آج تک میں آپ کو ایک داستانوی شخصیت سمجھتا تھا اور آپ سچ مچ موجود ہیں۔"

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.5 No.4 2021

میں نے اس محفل میں شامل دیگر ادیبوں کو متوجہ کر کے نہایت پر مسرت اور پر فخر لہجے میں کہا کہ یہ تو عبداللہ حسین ہیں۔ ظاہر ہے فوری طور پر ان کی پرستش شروع ہو گی۔ "اداس نسلیں" کے کردار نعیم اور عذرا وغیرہ زیر بحث آ گئے اور ایرن مور تمباکو کی مہک مزید گھنی ہو گئی!"(25)

عبداللہ حسین کا خاکہ لکھنا ان کے اس لیے بھی مشکل نہ تھا کہ ان دونوں میں دوستی، محبت اور عقیدت کا رشتہ چالیس سال کی رفاقت پر محیط تھا۔ مستنصر نے ان کے زندگی کے مختلف پہلوؤں کے بیان میں جذبات کو قابو میں رکھتے ہوئے واقعات بیان کیے ہیں جس میں محبت، عقیدت اور احترام کے جذبات موجزن نظر آتے ہیں۔ انھوں نے مختلف حالات وواقعات کی مدد سے نہایت کامیابی سے ان کی زندگی کے منور گوشے قاری کی نذر کیے ہیں۔ مندرجہ بالا اقتباس میں انھوں نے پہلی ملاقات کے ساتھ عبداللہ حسین کا حلیہ، لباس، اندازِ گفت گو کی دل کش عکاسی اپنے منفرد اسلوب میں کی ہے۔ جس میں محبت وعقیدت کے ساتھ بے تکلفی اور شوخی کے جذبات نظر آتے ہیں۔ ان کے زندگی نہایت سادہ تھی، یہاں تک کہ ایک ہی سالن کئی کئی دن چلتا رہتا۔ مستنصر ایسے ہی ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"جہاں تک خوراک کا معاملہ ہے وہ میری طرح ایک چٹخارے لینے والا شخص نہ تھا۔ مجھے شک ہے کہ وہ خوراک کے ذائقے سے نا آشنا تھا۔ کھانا اس کے لیے کوئی مسئلہ کوئی تردد نہ تھا۔ میں کسی دوپہر کے کھانے کے بعد، کچھ دیر بعد پوچھتا کہ خان صاحب، گوبھی گوشت کیسا تھا؟ تو وہ سوچ میں پڑ جاتا: "اچھا، تو ہم نے لنچ پر گوبھی گوشت کھایا تھا؟" میمونہ صرف ایک بار عبداللہ سے بدگمان ہوئی۔ عبداللہ حسب معمول ڈیفنس کے ایم بلاک میں تنہا رہتا تھا، بھابی فرحت لنڈن جا چکی تھی تو میمونہ نے پوچھا کہ آپ کھانے کا کیا کرتے ہیں؟

اور وہ میمونہ کو ہمیشہ مامونا کہتا تھا: "مامونا، میرے گھر کے پچھواڑے میں کسی ملازم نے مونگرے کاشت کر رکھے تھے، پچھلے ہفتے وہ مجھے مونگروں کی ایک ٹوکری دے گیا تو میں نے ہانڈی پر چڑھا کر وہ مونگرے پکا لیے۔ نزدیکی تندور سے صبح شام دو روٹیاں لے آتا ہوں اور مونگروں کے ساتھ مزے سے کھاتا ہوں۔ یہ مونگرے دو ہفتے تو میرے کام آتے رہیں گے۔"

میمونہ نے گھر واپسی پر کہا: "یہ کچھ عجیب سا شخص نہیں ہے؟ صبح شام دو تین ہفتے مونگرے کھاتا رہتا ہے!"(26)

عبداللہ حسین کی خوراک کے بارے میں خاکہ میں ایک جگہ یوں لکھتے ہیں:

"وہ میرے گھر آنا چاہتا تھا لیکن میں نے منع کر دیا: "خان صاحب! آپ اس کیمیو وغیرہ سے فارغ ہو لو، شوگر کے مریضوں کی مانند لیکومیا کے مریض بھی مناسب علاج معالجے سے دیر تک چلتے ہیں اور میں بھی ذرا ہمت پکڑ لوں۔ دس کلو وزن کم ہو چکا ہے تو میر اڈھلکا ہوا ماس ذرا پھر سے ہڈیوں کے ساتھ پیوست ہو جائے تو پھر ان شاء اللہ حسب معمول افضال کے پاس، سنگ میل، جائیں گے، خان بابا کے پراٹھے اور بھنا ہوا گوشت کھائیں گے۔"

"نہیں یار، مزنگ کی تلی ہوئی بشیر دار الماہی کی مچھلی کھائیں گے۔ یہ افضال یوں ہی ہانکتا ہے کہ گرمیوں میں مچھلی نہیں کھاتے۔ کیوں نہیں کھاتے؟ سارا بنگال اور انڈونیشیا کھاتا ہے۔ اسے ابھی سے بتا دو۔"

عبداللہ حسین صرف تلی ہوئی اور وہ بھی مزنگ کی مچھلی انتہائی رغبت سے کھاتا تھا اور افضال اتنا بر خوردار تھا کہ واپسی پر مچھلی کے ڈھیر پیک شدہ حالت میں کار میں ہمارے ساتھ جاتے"(27)

عبداللہ حسین نے زندگی کا طویل عرصہ تنہائی میں گزارا کیوں کہ وہ محفلوں میں جانا اور لوگوں سے زیادہ ملنا پسند نہیں کرتے تھے۔ اس کے باوجود انھوں نے بہت سے سیمینار، کانفرس اور ادبی محفلوں میں مستنصر کے ہمراہ شرکت کی۔ انھوں نے ادبی زندگی کے حوالے سے واقعات اور ادبی موضوعات پر دونوں کے درمیان ہونے والے مباحث کو بھی اپنی تحریر میں پیش کیا ہے۔ عبداللہ حسین کے تخلیق ادب پر نقادوں نے بہت تنقید کی کہ انھیں لکھنا نہیں آتا بالآخر وہ ان کی ادبی عظمت کو ماننے پر تیار ہو گئے۔ انھوں نے ماضی کے ان ادبی واقعات کو اپنے اسلوب سے حال میں زندہ اور متحرک فلم میں تبدیل کر دیا ہے۔ ادبی محفلوں سے متعلق خوش گوار واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.5 No.4 2021

"ہم دونوں فلیٹیز ہوٹل میں کسی ادبی تقریب میں شمولیت کے بعد اس کی ایک طویل پرانی کار کی جانب بڑھ رہے تھے جب مظفر علی سید، نامور نقاد، میرا بازو تھام کر کہتے ہیں: "تارڑ، یہ عبداللہ حسین ہیں؟ ان سے میرا تعارف کرواؤ۔"

میں نے مناسب توصیفی انداز میں تعارف کرواتے ہوئے کہا: "خان صاحب۔۔۔" لیکن عبداللہ نے مجھے فقرہ مکمل نہ کرنے دیا اور نہایت خشمگیں نگاہوں سے سید کو دیکھتے ہوئے کہا: "ہاں ہاں، میں انھیں جانتا ہوں۔ آپ وہی نقاد ہیں جنھوں نے لکھا تھا عبداللہ حسین کو اردو لکھنی نہیں آتی۔"

اب مظفر علی سید اس نوعیت کے شدید رد عمل کے لیے تیار نہیں تھے، وہ کچھ ہکلاتے بھی تھے تو کچھ زیادہ ہی ہکلا کر کہنے لگے: "نہیں نہیں، اب لکھنی آگئی ہے۔" تو عبداللہ نے ترت جواب دیا: "نہیں، آپ کو سمجھ اب آئی ہے۔"

مجھے عبداللہ کا یہ جارحانہ انداز اچھا نہ لگا۔ ہم گورنر ہاؤس کے قریب تھے جب اس نے میری خفگی کو بھانپ لیا: "دیکھو تارڑ، ان لوگوں نے میرے ناک میں دم کر رکھا تھا کہ عبداللہ حسین کو اردو لکھنی نہیں آتی، اس کی گرائمر غلط ہے، گالیاں بہت لکھتا ہے۔ یہ 'اداس نسلیں' میں کیڑے نکالتے رہے اور اب مجبور ہو گئے ہیں اسے ایک بڑا ناول ماننے پر۔ کرشن چندر اور راجندر سنگھ بیدی نے اسے پسند کیا تو یہ کون ہوتے ہیں؟ اب پچھلے دنوں ہندوستان کے اہم نقادوں نے پچھلی صدی کے جن دس بڑے ناولوں کو "ذہن جدید" میں منتخب کیا ہے اس میں "اداس نسلیں" پہلے نمبر پر ہے اور "آگ کا دریا" دوسری پوزیشن ہے تو یہ سروے پڑھ کر ان کی ماں مر گئی اور ہاں، تمھارا ناول "بہاؤ" بھی اس فہرست میں شامل کیا گیا ہے اور یہ بہت بڑی اچیومنٹ ہے۔"(28)

مستنصر حسین تارڑ کے ،عبداللہ حسین سے تعلقات کافی گہرے تھے جس کے باعث انھوں نے ان کی شخصیت کے تاثرات بہتر انداز میں اجاگر کیے ہیں۔ خاکہ نگاری کے لیے ان کے پاس مواد کی کثرت تھی لیکن اس کے باوجود انھوں حقیقت نگاری سے کام لیا اور ان کی زندگی کی منفرد، جان دار اور دل کش اور متحرک صورت پیش کی۔ انھوں نے عبداللہ حسین کی زندگی کی حقیقی تصویریں پیش کی ہے ان میں کسی قسم کی رنگ آمیزی یا تخیل نگاری سے کام نہیں۔ انھوں نے بغیر کسی مبالغہ آرائی کیاور مدح سرائی کے ان کی حقیقی زندگی کا عکس پیش کیا ہے جن پر اکثر لوگوں کے لیے یہ باتیں قابلِ اعتراض ہو سکتی ہیں۔ ان کے کردار کی پیش کش میں انھوں کسی مبالغہ آرائی سے کام نہیں لیا بل کہ حقیقت بیان کرنے میں کوئی آرا محسوس نہیں کیا۔ وہ ان کی شخصیت کی ظاہری و باطنی خصوصیات کو قاری سے اوجھل نہیں کرتے بل کہ حقیقت نگاری سے مزید اثر انگیز بنا دیتے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ لکھتے ہیں:

"اس کے اکلوتے بیٹے کی شادی مصور اور خطاط احمد خان کی بیٹی سے ہو رہی تھی۔ بارات تیار تھی اور ہم کچھ دوست، جن میں فخر زمان بھی شامل تھا، گھر کی بالائی منزل پر خورونوش میں محو تھے اور بار بار پیغام آ رہے تھے کہ بارات تیار، آپ آئیں اور دلھن کے گھر چلیں، لیکن عبداللہ حسین اور میں شاید سارتر اور کافکا کے بارے میں کسی گفت گو میں غرق تھے، اور جب ایک اور پیغام آیا کہ اب تو آجائیں، بارات تیار ہے، تو عبداللہ حسین نے انکار کر دیا۔

"نکاح ہو چکا ہے، وہ بچی میری بہو ہو چکی ہے، تو آپ جائیں اور اسے لے آئیں۔ میں اور تارڑ ایک سنجیدہ ادبی مسئلے پر گفت گو کر رہے ہیں۔"

بمشکل، یہ میں تھا جس نے عبداللہ حسین کو راضی کیا کہ " خان صاحب، علی آپ کا اکلوتا بیٹا ہے، آیئے، چلتے ہیں۔"(29)

مستنصر حسین تارڑ نے عبداللہ حسین کے خاکے میں واقعات نگاری سے کام لیتے ہوئے شخصیت کے چھپے ہوئے گوشے سامنے لانے کی سعی کی ہے جس سے عبداللہ حسین کی انفرادیت نمایاں ہوتی ہے۔ انھوں نے واقعات کے بھرمار سے خاکہ کو طوالت اختیار کرنے نہیں دی بل کہ وہ واقعات بیان کیے ہیں جو ان کی نظر میں اہم تھے۔ عبداللہ حسین کو زندگی میں اپنے درز قد امتی کی وجہ سے مشکل کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کو اپنے جوتے بنوانے کے لیے بھی لندن کے ایک خاص سٹور سے رابطہ کرنا پڑتا جو دیو قامت جوتے بنانے میں ماہر تھے۔ عمر کے آخری حصے میں ان کے مشکلات میں مزید اضافہ ہو گیا۔ ان کی حالت قاری کے لیے قابل رحم ہو جاتی ہے لیکن اس کے باوجود وہ اس سے دل برداشتہ نہ ہوتے تھے۔ ڈھلتی عمر کا ایک واقعہ کا منظر یوں پیش کرتے ہیں کہ اس کی دکھ بھری تصویر قاری کے آنکھوں کے ساتھ گھوم جاتی ہے۔ مستنصر لکھتے ہیں:

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.5 No.4 2021

"کوئی شام ایک ایسی شام تھی، بیچ لگژری ہوٹل میں، جب کہ کھلی کھڑکیوں میں سے سمندر کی نم آلود ہوائیں یوں آتی تھیں کہ کمرے کی ہر شے نمکین کرتی تھیں، یہاں تک کہ تکیے پر سر رکھتے تو اس میں سے بھی نمک شمک کی مہک آتی۔ ہم دونوں عبداللہ حسین کے کمرے میں گئی شب نمک آلود ہوتے، دنیا جہاں کی باتیں کرتے، ہم عصر ادیبوں کی بدخوئی کرتے، کبھی ماضی میں سفر کرتے چلے جاتے اور کبھی اس بے رحم حال کی باتیں کرتے کھلی کھڑکیوں میں سے آنے والی سمندر کی نمکین ہوا میں بھیگتے تھے جب عبداللہ واش روم جانے کے لیے اٹھا اور میرے سامنے سے گزر کر یک دم لڑکھڑایا، سنبھل نہ سکا اور فرش پر گر گیا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی پر اس سے اٹھا نہ گیا کہ اس کی دراز قامتی اس بڑھاپے میں آکر ایک ذلت اور آزار ہو چکی تھی۔ فرش پر چاروں شانے چت پڑے عبداللہ حسین کو اٹھانے کے لیے میں اٹھا۔ میں نے اس کی بغلوں میں ہاتھ دے کر اسے اٹھانے کی کوشش کی پر وہ کب مجھ ناتواں سے اٹھتا تھا۔ میں نے، جتنا بھی زور مجھ میں تھا، لگایا اور عبداللہ نے بھی اپنے تئیں گھسٹ گھسٹ کر بہت کوشش کی پر اس سے اٹھا نہ گیا۔

ہم دونوں کھلی کھڑکی سے آنے والی سمندر کی نمکین ہوا میں نمکین ہوتے بیچ لگژری ہوٹل کے کمرے کے فرش پر چت پڑے تھے۔ نہ میں اسے اٹھا سکتا تھا اور نہ اس سے اٹھا جا سکتا تھا اور تب عبداللہ حسین نے اپنا ٹریڈ مارک قہقہہ لگا کر کہا: "تارڑ،۔۔ میں اتنا لاچار ہو چکا ہوں کہ فرش پر چت پڑا ہوں اور تم بھی مجھے اٹھا نہیں سکتے۔۔۔ تم جاؤ اپنے کمرے میں آرام کرو۔ صبح کوئی نہ کوئی ہوٹل کا کارندہ آئے گا جو مجھے سہارا دے کر بستر پر لٹا دے گا۔"

"خان صاحب!" میں اب اس عجیب سی صورت حال سے لطف اندوز ہونے لگا تھا، "آپ ذرا تصور کیجیے کہ تقریباً نصف شب کا سماں ہے، کمرے کے اندر بحیرہ عرب کی نمکین ہواؤں کا راج ہے اور فرش پر ہم دونوں لاچار۔۔۔ بڑھاپے کے ہاتھوں بے سکت ہو چکے۔۔۔ پڑے ہیں۔" عبداللہ حسین نے اپنا ٹریڈ مارک قہقہہ پھر سے لگایا۔۔"

وہ فرش پر ایک طویل القامت شجر کی مانند پڑا تھا اور قہقہے لگا رہا تھا۔

عجیب شب تھی!

بالآخر وہ گھسٹتا ہوا پلنگ کی پشت تک آیا، اس کے ساتھ ٹیک لگا کر اپنے آپ کو سیدھا کیا، جب کہ میں اسے سہارا دیتا تھا، اور وہ اپنی پوری قامت سے کھڑا ہو گیا: "تارڑ۔ یہی تو بہن چود زندگی ہے۔۔۔ شکریہ!"(30)

عبداللہ حسین بڑھاپے میں خون کے کینسر کی بیماری لیکومیا کا شکار ہوئے جس کے باعث انھیں کیموتھراپی کے مرحلے سے گزرنا پڑا اور ان کی بیماری شدت اختیار کر گئی۔ انھیں لاہور ڈیفنس کے نیشنل ہسپتال میں داخل کروا دیا گیا۔ ان کے پھیپھڑوں میں پانی بھر گیا جس کے اخراج کا عمل بے اذیت ناک تھا۔ مشین کی کھڑکھڑاہٹ ان کے لیے آزار کا باعث تھی اور بار بار کہتے کہ اس مشین کو بند کر دو کیوں کہ وہ اس کی کھڑکھڑاہٹ برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے پھیپھڑوں سے پانی خارج کیا گیا تو کینسر کا روگ ان کے پھیپھڑوں میں داخل ہو گیا اور وہ کومے میں چلے گئے۔ عبداللہ حسین کے آخری وقت کا بیان مستنصر کے لیے انتہائی دردناک تھا کیوں کہ ان چھوٹے بھائی زبیر بھی اس دردناک کیفیت کا شکار ہو کر خالق حقیقی سے جا ملے تھے۔ مستنصر حسین تارڑ لکھتے ہیں:

"کومے میں چلے جانے سے پیش تر انھوں نے جو آخری بات کی وہ یہی تھی کہ مستنصر کا جانے کیا حال ہے۔ وہ بھی آپ کے بارے میں فکر مند رہے۔ نور تقریباً پون گھنٹا مجھ سے باتیں کرتی رہی اور روتی رہی۔ "نور میں ابھی آجاتا ہوں۔"

"نہیں۔۔۔ میں نہیں چاہتی آپ انھیں اس حالت میں دیکھیں۔"

اس پوری شب میں بہت کم سویا اور میں نے عبداللہ حسین کی صحت کے لیے دعا نہ کی، صرف یہ دعا کی کہ اللہ تعالیٰ اس کی مشکل آسان کر دے۔ وہی دعا جو میں نے اپنے چھوٹے بھائی زبیر کے لیے کی تھی جب وہ جگر کے کینسر کا شکار ہو کر کسی اندرونی اذیت کی شدت سے، جب کہ اس کی آنکھیں کچھ نہ دیکھتی تھیں، اس کی دراز قامتی، جو عبداللہ حسین ایسی تھی، ایک تتلی کی مانند اذیت سے پھڑپھڑاتی تھی ۔۔ کہ یا اللہ! اس کی مشکل آسان کر دے! اور اس نے کر دی۔

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.5 No.4 2021

اگلے دن، تقریباً ساڑھے دس بجے تاریخ ۴ جولائی، نور کا فون آگیا: "انکل۔۔۔ بابا چلے گئے ہیں، بس ابھی ابھی گئے ہیں۔" میں ایک طمانیت سے دوچار ہوا کہ شکر ہے منزل آسان ہوگئی۔"(31)

عبداللہ حسین کو ان کی بیماری کی نوعیت کی وجہ سے جلدی تدفین کی ضرورت تھی کیوں کہ میت بہت تیزی سے زوال کا شکار ہو رہی تھی۔ ڈیفنس لاہور کے قبرستان میں تدفین کے لیے کم از کم آٹھ گھنٹے کا وقت درکار تھا اس کی پیش نظر انھیں لاہور بھٹہ چوک کے قبرستان میں دفن کرنے کا انتظام کیا گیا۔ عبداللہ حسین کا اکلوتا بیٹا علی جو کہ دبئی میں مقیم تھا اپنے والد کی میت کو کاندھا دینے اور دفن کرنے سے محروم رہا۔ عبداللہ حسین کی وفات سے کچھ عرصہ پہلے مستنصر حسین تارڑ خود بھی شدید علیل رہے انھیں متعدد آپریشنوں سے گزرنا پڑا۔ جس کے نتیجے میں ان کا جسم ایک روبوٹ کی شکل اختیار کر گیا تھا اور پورے بدن میں ٹیوبیں، نالیاں اور پلاسٹک کی مختلف شکلوں کے بیگ پیوستہ رہے۔ انھیں چند روز پہلے ہی ہسپتال سے گھر منتقل کیا گیا تھا جب عبداللہ حسین کی وفات ہوئی۔ انھوں نے بیماری کے حالت میں ان کی تدفین میں شرکت کی۔ عبداللہ حسین جنھیں ساری عمر اپنی دراز قامت کی وجہ سے مشکل کا سامنا کر پڑا قبر میں اتارتے وقت بھی ان کی قدامت آڑے آگئی۔ عبداللہ حسین کی تدفین کے وقت کا منظر بیان کرتے ہوئے مستنصر رقم طراز ہیں:

> "اور تب مجھے ایک ہول سا اٹھا کہ نہ میں عبداللہ حسین کے جنازے میں شریک ہو سکا اور نہ ہی مجھے کچھ خبر ہے کہ وہ اسے کہاں لے گئے ہیں؟ اس سے کچھ آخری سلام دعا بھی نہ کی تو یہ کیسی یاریاں اور دلداریاں ہیں؟ تو میں نے سمیر سے کہا کہ مجھے لے چلو۔ اس نے کہا کہ آپ چل نہیں سکتے، وہاں دھوپ بہت ہو گی، آپ کے ٹانکے ابھی کچے ہیں، لیکن میں بضد رہا: "مجھے لے چلو۔"
>
> سورج قدرے ڈھل رہا تھا اور قبر کے اوپر جو سائبان تنا تھا اس کا سایہ بھی ڈھل کر ذرا پرے ہو گیا تھا اور قبر پر دھوپ ہی دھوپ تھی۔ بالآخر گورکن، جو موت کے فرہاد تھے، قبر سے باہر آگئے۔ چارپائی کو اٹھا کر قبر کی مٹی کے برابر میں رکھا گیا اور پھر شاید یہ زیب تھا جس نے مجھے کہا: "تارڑ صاحب! دیکھ لیں۔" گوری سیج پر سو رہی تھی۔۔۔ اس کے رخ سے پردہ ہٹایا گیا۔۔۔ عبداللہ حسین کا چہرہ موت کی زردی میں بھی ایک زرد بہار کی مانند تھا۔ اس کی فرنچ کٹ ڈاڑھی کے بال، چاہے سفید چند ایک سیاہ، سب کے سب غروب کی زردی میں رنگے ہوئے تھے۔ میں نے صرف ایک نظر ڈالی اور پیچھے ہو گیا: "لو جی، جناب عالی! پھر ملیں گے۔"
>
> مجھ میں اگر سکت ہوتی تو میں اسے خود قبر میں اتارتا۔ پر وہ کب مجھ ناتواں سے سنبھلتا تھا!
>
> اسے قبر میں اتارا گیا اور جب لحد میں لٹایا گیا تو ایک گورکن کی آواز آئی: "گھٹنے سیدھے کرو۔" اور دوسرے گورکن نے کہا: "سیدھے نہیں ہو رہے۔" اس کی قبر بھی اس کی قامت سے مختصر رہ گئی تھی۔ عبداللہ حسین کو نہ کبھی اس کی قامت کا نقاد ملا، نہ چارپائی، اور نہ ہی قبر۔ راکھ، راکھ میں اور خاک، خاک میں اور خاک میں عبداللہ حسین۔"(32)

شفیق الرحمن، کرنل محمد خان، محمد خالد اختر اور عبداللہ حسین جیسے نابغہ روزگار جنھوں نے مزاح، شگفتگی اور رومان سے اردو ادب کو پروان چڑھایا۔ اردو ادب کے یہ درخشندہ ستارے جو ادب کے آسمان پر پوری آب و تاب کے ساتھ روشن رہے۔ انھوں نے افسانہ نگاری، مزاح نگاری، سفر نامہ نگاری، تراجم اور تنقید سے ادب میں نئے در وا کیے۔ ان کی تحریریں اپنے اندر ایک منفرد خوشبو اور چاشنی سموئے ہوئے ہیں جو ان کو دوسرے ہم عصر ادیبوں سے ممتاز حیثیت عطا کرتی ہے۔ ان منفرد اور ممتاز لوگوں کی زندگی کی گرہیں ان کو خطوط سے کھلتی ہیں جو نہایت پر کشش انداز میں اپنے اندر ان کی ذاتی اور علمی و ادبی زندگی کے اہم راز رکھتے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ کا ان ادیبوں میں خاص طور پر عبداللہ حسین کے درمیان دوستی کا نہیں، ایک عاشق معشوق کا سلسلہ تھا کیوں کہ دوستی اتنی پائدار نہیں ہوتی جتنی کہ عاشقی کا کوئی انت نہیں ہوتا۔ انھوں نے زندگی کے چالیس سال ایک دوسرے کی رفاقت میں گزارے۔ لاہور، اسلام آباد، کراچی، فیصل آباد کے ادبی محافل میں ایک دوسرے کے ساتھ رہے۔ یہاں تک کہ ہوٹل میں کمرا بھی ایک دوسرے کے ساتھ منسلک لیتے تھے اس لیے مستنصر کے علاوہ ان کا کوئی اور دوست نہ تھا۔ ان خاکے میں انھوں نے شفیق الرحمن، کرنل محمد خان، محمد خالد اختر اور عبداللہ حسین کی زندگی کے مختلف گوشوں کو منور کیا ہے جو کہ حقیقت نگاری پر مشتمل ہیں۔ مستنصر کا مشاہدہ بہت عمیق ہے۔ انھوں نے اپنی یادداشت کے سہارے ان ادیبوں کی زندگی کے معمولی معمولی جزئیات پیش کرنے میں اپنی ذہانت کا ثبوت پیش کیا ہے۔ خاکہ نگاری میں مستنصر نے اپنے روایاتی اسلوب جو کہ افسانوی طرز پر مبنی ہے، اختیار کیا ہے۔ انھوں نے فنی اعتبار سے خاکہ نگاری میں خاصی وسعت پیدا کر دی ہے۔ انھیں قدرت کی طرف سے افسانوی طرز اسلوب عطا ہوا ہے۔ انھوں نے اپنی تخیل کی رنگ آمیزی

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.5 No.4 2021

سے ان ادیبوں کے ایسے خاکے کھینچے ہیں جس سے ان کی سیرت، صورت، کردار اور عادات کا منفرد، جان دار، دل کش اور متحرک صورتیں قارئین کے سامنے آتی ہیں۔ انھوں نے فن کارانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے خاکہ نگاری میں منظر نگاری، مکالماتی رنگ، تخیلاتی رنگ، فلش بیک تکنیک، زبان و بیان کی سچائی، شوخی اور حقیقت نگاری کو شامل کر دیا ہے۔ خاکہ تحریر کرتے ہوئے ان کے سامنے مواد کی کثرت تھی کیوں کہ ان کے شفیق الرحمن، کرنل محمد خاں، محمد خالد اختر اور عبداللہ حسین سے تعلقات بہت گہرے تھے۔ انھوں نے ان خاکے میں ان ادیبوں کی شخصیت سے متعلق اہم معلومات کا اندار کیا ہے۔ ان ادیبوں کے یہ خاکے انتہائی دل کش، دل چسپ اور فنی خوبیوں سے بھرپور ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ نے خاکہ نگاری کرتے ہوئے اس غیر افسانوی صنف نثر کو جدت سے ہم کنار کیا ہے۔ اس میں نئے امکانات کا راہ روشن کر دی ہے کیوں کہ یہ خاکے منفرد حیثیت کا حامل ہے۔ ان کی خاکہ نگاری کے کمال ہیں کہ قارئین کو شفیق الرحمن، کرنل محمد خاں، محمد خالد اختر اور عبداللہ حسین کی شخصیت کو سمجھنے کا موقع ایک وسیع اور مختلف تناظر میں ملتا ہے۔

حوالہ جات:

۱۔ طیبہ خاتون، ڈاکٹر، اردو نثر کی داستان، آزاد کشمیر: ارسلان بکس میر پور، ۲۰۰۳ء ص
۲۔ تارڑ، مستنصر حسین، خطوط: شفیق الرحمن، کرنل محمد خان، محمد خالد اختر، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء ص ۷
۳۔ تارڑ، مستنصر حسین، خطوط: شفیق الرحمن، کرنل محمد خان، محمد خالد اختر، ص ۸
۴۔ اشفاق احمد ورک، ڈاکٹر، شفیق الرحمن: شخصیت اور فن، اسلام آباد: اکادمی ادبیات، ۲۰۰۶ء، ص ۹
۵۔ تارڑ، مستنصر حسین، خطوط: شفیق الرحمن، کرنل محمد خان، محمد خالد اختر، ص ۲۵۔۲۶
۶۔ تارڑ، مستنصر حسین، خطوط: شفیق الرحمن، کرنل محمد خان، محمد خالد اختر، ص ۱۸
۷۔ تارڑ، مستنصر حسین، خطوط: شفیق الرحمن، کرنل محمد خان، محمد خالد اختر، ص ۳۵
۸۔ تارڑ، مستنصر حسین، خطوط: شفیق الرحمن، کرنل محمد خان، محمد خالد اختر، ص ۲۰
۹۔ تارڑ، مستنصر حسین، خطوط: شفیق الرحمن، کرنل محمد خان، محمد خالد اختر، ص ۴۳
۱۰۔ تارڑ، مستنصر حسین، خطوط: شفیق الرحمن، کرنل محمد خان، محمد خالد اختر، ص ۹۔۱۰
۱۱۔ تارڑ، مستنصر حسین، خطوط: شفیق الرحمن، کرنل محمد خان، محمد خالد اختر، ص ۴۰
۱۲۔ اظہار احمد گلزار، ڈاکٹر؛ "کرنل محمد خان کا فنِ ظرافت" ?www.punjund.com/Articlesdetail.aspx
۱۳۔ محمد اسماعیل صدیقی، بریگیڈر (ر)؛ "کرنل محمد خان: شخصیت اور فن"، اسلام آباد، اکادمی ادبیات، ۲۰۰۸ء، ص ۷
۱۴۔ تارڑ، مستنصر حسین، خطوط: شفیق الرحمن، کرنل محمد خان، محمد خالد اختر، ص ۷۱
۱۵۔ تارڑ، مستنصر حسین، خطوط: شفیق الرحمن، کرنل محمد خان، محمد خالد اختر، ص ۷۱
۱۶۔ تارڑ، مستنصر حسین، خطوط: شفیق الرحمن، کرنل محمد خان، محمد خالد اختر، ص ۷۲
۱۷۔ تارڑ، مستنصر حسین، خطوط: شفیق الرحمن، کرنل محمد خان، محمد خالد اختر، ص ۷۳
۱۸۔ تارڑ، مستنصر حسین، خطوط: شفیق الرحمن، کرنل محمد خان، محمد خالد اختر، ص ۱۰۴
۱۹۔ تارڑ، مستنصر حسین، خطوط: شفیق الرحمن، کرنل محمد خان، محمد خالد اختر، ص ۸۵
۲۰۔ تارڑ، مستنصر حسین، خطوط: شفیق الرحمن، کرنل محمد خان، محمد خالد اختر، ص ۱۱۲
۲۱۔ تارڑ، مستنصر حسین، خطوط: شفیق الرحمن، کرنل محمد خان، محمد خالد اختر، ص ۱۱۳
۲۲۔ تارڑ، مستنصر حسین، خطوط: شفیق الرحمن، کرنل محمد خان، محمد خالد اختر، ص ۱۱۵
۲۳۔ تارڑ، مستنصر حسین، خطوط: شفیق الرحمن، کرنل محمد خان، محمد خالد اختر، ص ۱۱۷
۲۴۔ تارڑ، مستنصر حسین، خطوط: شفیق الرحمن، کرنل محمد خان، محمد خالد اختر، ص ۱۲۲
۲۵۔ تارڑ، مستنصر حسین، سویرا، مشمولہ مضمون، عبداللہ حسین، لاہور؛ قوسین، فیصل ٹاؤن، ۲۰۱۷ء، ص ۱۷۳۔۱۷۴
۲۶۔ تارڑ، مستنصر حسین، سویرا، ص ۱۶۵۔۱۶۶
۲۷۔ تارڑ، مستنصر حسین، سویرا، ص ۱۷۷
۲۸۔ تارڑ، مستنصر حسین، سویرا، ص ۱۶۷
۲۹۔ تارڑ، مستنصر حسین، سویرا، ص ۱۶۶
۳۰۔ تارڑ، مستنصر حسین، سویرا، ص ۱۷۰۔۱۷۱
۳۱۔ تارڑ، مستنصر حسین، سویرا، ص ۱۷۸